

بارش سنگ

(ناول)

جیلانی بانو

BARISH-E-SANG

(Novel)

(Revised & Enlarged)

by

Jeelani Bano

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستان سے خفا

زرد پتوں کا بن

زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھو کے جیالوں کے نام

بادشاہ جہاں، والی ما سوا؟، نائب اللہ فی الارض وبقا کے نام

جس کی ڈھوروں کو ظالم ہنکالے گئے ہیں

جس کی بیٹی کو ڈا کو اٹھائے گئے ہیں

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوارنے کاٹ لی ہے

دوسری مالٹے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے

جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے

دھجیاں ہو گئی ہے

ان دکھی ماؤں کے نام

رات میں جب کہ بچے بلکتے ہیں اور

نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں میں سنبھلتے نہیں

دکھ بتاتے نہیں  
منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں  
ان حسیناؤں کے نام  
جن کی آنکھوں کے گل  
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بے کار کھل کھیل کے  
مُر جھاگئے ہیں  
ان بیابنتوں کے نام  
جن کے بدن  
بے محبت ریا کاریچوں پہ سج سج کے اکتا گئے ہیں  
بیواؤں کے نام  
کٹھڑیوں اور گلیوں، محلوں کے نام  
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں

کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو  
جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ وبکا  
آنچلوں کی حنا  
چوڑیوں کی کھنک  
کاکلوں کی مہک  
آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُر  
پڑھنے والوں کے نام  
وہ جو اصحابِ طبل و علم  
کا تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے  
پہنچے مگر لوٹ کر گھر نہ آئے  
وہ معصوم جو بھولپن میں  
وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن  
لے کے پہنچے جہاں

بٹ رہے تھے، گھٹاٹوپ ، بے انت راتوں کے سائے

ان اسیروں کے نام

جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر

جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں

جَل جَل کے انجم نما ہو گئے ہیں

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام

(فیض)

آج کھیتوں میں بیج پڑے گا۔

بہاروں کے بیج۔ ارمانوں کے بیج

ابھی صبح نہیں ہوئی۔ پورب کی اور سے بڑھتے ہوئے ، سیاہ بادلوں نے پوری ”چیکٹ پلی“ کو ڈھانپ لیا ہے۔ ”چیکٹ پلی“ میں اُجالا دیر سے آتا ہے۔ کچھ گھروں میں تو بھی نہیں آتا۔ اس گھور اندھیارے میں احمد بی کی ہلکورے لیتی آواز اور چگی کی گھوں گھوں بستی والوں کے دلوں میں اُجالے کی امید جگاتی ہے۔ وہ مان لیتے ہیں کہ اب اُجالا ہونے والا ہے۔

ہستی مستی کے دانے سر انا گے اماں..... ہر دم اللہ ہو اللہ ہو

سیدھے ہاتھ سے دانہ ڈالنا۔

دانبے ہاتھ سے چگی بھرانا گے اماں..... ہر دم اللہ ہو اللہ ہو

اللہ ہو اللہ ہو... سلیم چونک کر اٹھ بیٹھا۔ جلدی سے اس نے کلمہ پڑھ کر اپنے دونوں انگوٹھے چومے اور اماں کے گنگنانے کی آواز سے اندازہ لگا لیا کہ اب اُجالا ہونے والا ہے۔ گھپ اندھیرے میں اسے معلوم تھا کہ چکی کہاں ہے۔ اور اماں کہاں ہے.....بیٹھی ہے

’ ’ چیکٹ پلی “کے بچے اندھیرے میں راہ ٹٹولنے کے عادی ہو گئے

کیونکہ ان کے گاؤں کا نام ہی ”چیکٹ پلی“ تھا۔ یعنی اندھیر نگری۔

ہوا کتنی تیز چل رہی ہے۔ بکریوں کا چھپر ہوا سے پھڑ پھڑا رہا ہے۔

جنگل کی طرف سے ہواؤں کے چیخنے کی آواز میں آ رہی ہیں۔

”مرگ“ لگ رہا ہے۔ سلیم نے خوش ہو کر سو چا۔ ”

مرگ لگے تو گرمی ختم ہو جاتی ہے۔ ہر سال مرگ کبھی مینڈک پر سوار ہو کر آتا کبھی ہرن پر۔ سلیم کو بڑی کھوج ہونی کہ اس سال مرگ نے اپنے لئے کونسی سواری پسند کی۔ ”دیول“ کا پنٹلو لوگوں کا بتاتا تھا کہ مرگ کیسے آیا... اگر مینڈک ہو... پر سوار ہے تو خوب بارش ہوگی۔ فصلیں اچھی ہوں گی۔ لوہ مزے کرو

اور اگر ہرن پر سوار ہے تو بس ہرن کی طرح بھاگتا ہوا موسم چلا جائے گا۔ دو چار بارشیں ہوں گی نہ ہوں گی۔ خوب سوکھا پڑے گا۔ ندیاں سوکھ جائیں گی۔ فصلیں مرجھا ئیں گی لوگ پانی کو ترسیں گے۔

مگر پچھلے برس پنٹلونے بتایا تھا کہ ”مرگ“ مینڈک پر سوار ہے۔ سلیم اپنے دوستوں کے ساتھ خوب نا چا چیخا چلا یا... سارے کھیتوں میں خوشی کے مارے قلا بازیاں لگاتا پھرا... مگر آدھا سال بھی نہ بیٹا کہ لوگ پانی کے لئے ہائے ہائے کرنے لگے۔ صابر میاں، وینکٹ ریڈی اور دلاور علی خاں کے کھیتوں میں تو خوب اناج ہوا۔ باقی چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں فصلیں ویسی ہی سوکھی مرجھائی رہیں... تو کیا پنٹلو جھوٹ بولا تھا... یا ”مرگ“، وینکٹ ریڈی کے کھیتوں تک مینڈک پر سوار ہوا اور سلیم کے کھیت تک آکر ہرن پر بیٹھ گیا ؟

...سلیم کی سمجھ میں نہ آیا یہ چکر

آج کھیتوں میں بیج پڑنے والا ہے

مرگ لگتا ہے تین مہینے سے بیکار بیٹھا ہوا کسان خوشی کے مارے کھڑا ہو جاتا ہے سب کھیتوں کی طرف جاتے ہیں۔ جگہ جگہ ہل چل رہے ہیں۔ گو بری ڈالی جارہی ہے۔ صفائی ہو رہی ہے۔ بار بار نظریں آسمان پر جارہی ہیں۔

( دیوڑا۔ ”وانا با گارا والے“ ) ( او خدا، بارش خوب ہو

جب کھیتوں میں بیج ڈالنے کا دن آتا ہے، اس دن سب منہ اندھیرے اُٹھتے ہیں۔ جیسے آج عید کا دن ہو۔ بڑی بوڑھی عورتیں اس دن کماؤ پوتوں کا منہ دیکھتی ہیں، آنکھ کھول کر۔ سب نہا دھو کر پاک ہوتے ہیں، ہندو کسان اپنے نا گر اور بیلوں کو کھیتوں کے کنارے کھڑا کر کے سیندور لگاتے ہیں، ناریل پھوڑتے ہیں۔ جب کسی بری بھری گود والی سہاگن کے ہاتھوں سے چھو کر کھیتوں میں بیج ڈالنا شروع کرتے ہیں۔

مسلمان کسان بھی بڑے پیر صاحب کی فاتحہ دلواتے۔ مسجد میں کھیر پوری بھیجتے۔ پھر کھیتوں کے پاس جاکر ان کا دل نہ مانتا تو وہ بھی چپکے سے ہل پر سیندور کے بتو لگا کر ناریل پھوڑتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی کام تو تھا نہیں کہ خدا کو راضی رکھیں اور بھگوان سے منہ موڑ لیں !

آج کے دن کھیتوں میں بیج پڑتا ہے۔ آنے والے سال کی بہار اُگے گی، نیا چھپر پڑے گا۔ بیٹی کی شادی ہوگی۔ بندہ نواز کی مٹت چڑھانا ہے۔ نئی بھو گھر میں آے گی۔ رہن رکھنے والے ہاتھ آزاد ہوں گے۔

ان بیجوں میں آنے والے دنوں کی آس تھی۔ سکھ کے پھولوں کی خوشبو۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے احمد بی کے دل کا کنول کھلا دیا۔

آج برسوں کے بعد اس کا جی چاہا کہ اس وقت مستان گھر میں ہوتا تو وہ جاکر، ... اس کی تو ہر رات اکیلے کروٹیں بدلتے، بچوں کو کوسٹے پیٹتے گزرتی تھی۔ مستان سابو کار کے ہاں رہن تھا۔ ریڈی اسے رات کو بھی گھر نہیں جانے دیتا تھا، کیونکہ وینکٹ ریڈی کے سارے چھپے دبے کام رات ہی کو ہوتے تھے جو مستان کے سوا اور کوئی نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے کبھی ہفتہ میں ایک آدھ بار مستان چوری چھپے رات کو یوں گھر آتا جیسے رنڈی کے کوٹھے پر آیا ہو۔ اور احمد بی سچ مچ نئی نویلی دلہنوں کی طرح نخرے دکھاتی، اسے ستاتی، ترساتی۔ پھر مستان کی بابوں میں چھپ کر رونے لگتی۔ جیسے اس کا مرد بارہ برس کا بن باس کاٹ کے بھر آیا ہو۔ ... گیارہ بچوں کی ماں بن کر بھی وہ پیاسی تھی۔ جدائی کی آگ میں سنگتی۔

... ہر دم اللہ ہو۔ اللہ ہو ... ہستی مستی کے دانے سر انا گے اماں

سلیم کے آس پاس سب بھائی بہن سور بے تھے۔ پھٹے بورئیے پر وہ سب دالان میں ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے تو سردی کم لگتی تھی۔

چھی ! اماں نے بچوں کی کتنی بڑی پلٹن کھڑی کر دی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُونگھتے ہوئے سلیم

نے سوچا۔ ... آج کھیتوں میں بیج پڑے گا۔

یہ بات یاد آتی تو وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ وینکٹ ریڈی کا پھٹا ہوا نیکر اس کے ٹخنوں تک آرہا تھا سستی کے ٹکڑے سے اس نے نیکر کو کمر پر باندھا۔ باوا کی لمبی قمیص گلے میں ڈالی۔ پھر وہ چپکے سے آنگن کی طرف بڑھا کہ اماں کو خبر نہ ہو۔ موری کئے جا کر اس نے پیشاب کیا۔ اور بھاگا کھیتوں کی طرف۔ ابھی مولوی صاحب نے اذان نہیں دی تھی۔ ... اماں کے گانے کی آواز اسے جھٹ پٹ بی بی کی درگاہ تک سنائی دے رہی تھی۔

... ہستی مستی کے دانے سرانا گے اماں، ہر دم اللہ ہو اللہ ہو

باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سلیم کے سارے بدن میں کپکپی سی آگنی۔ جنگل کی طرف سے کالے بادل بڑھ رہے تھے۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تو جنگل کے پیچھے والی پہاڑیوں پر اُجالا پھیل جاتا۔ ان پہاڑوں پر پو چما (کالی ماتا) کا دیول تھا۔ پوچما کو ہر سال ایک جان کی قربانی چاہئے۔ اگر لوگ خوشی سے نہ دیں تو وہ زبردستی لے لیتی ہے۔ کبھی گاؤں میں کسی کا قتل ہو جاتا۔ کبھی کسی کنواری کی لاش پہاڑیوں کے نیچے ملتی۔ ... لوگ سہم جاتے تھے پوچما کے فہر سے۔ اسی لئے ہر سال برسات شروع ہوتے ہی ”بونال“ پو جا ہوتی ہے۔ ہندو عورتیں نہا دھو کر گیلے بالوں سے پوجا کا گھڑ اسر پر اٹھاتی ہیں۔ اس گھڑے کے اندر سات رنگ کے چاول ہوتے۔ گڑ اور دبی۔ اور پینٹ کی تھالی میں ناریل، سیندور اور پھولوں کے بیج جلتا ہوا چراغ بھرا ہوتا۔ سولہ سنگار کیے۔ چمکتی دمکتی، رنگ برنگی ساریاں پہنے سہاگنیں پوجا کے لئے گھروں سے باہر نکلتیں تو کام دھام چھوڑ کر مرد لوگ بے اختیار ادھر دیکھنے لگتے۔ آگے آگے دھبڑا بجتا۔ اس کے پیچھے قربانی کا بھینسا۔ اس کے پیچھے پوچما کے سائے والی جو گن عورتیں بال کھولے، ہاتھوں میں نیم کے پتے تھامے جھومتی ناچتی چلتیں۔ اس کے پیچھے مٹی کی گڑیوں ... جیسی بانکی چھبیلی عورتوں کی قطار، سر کے گھڑوں پر جلتے دیئے اٹھائے ہوئے

چاہے کتنی بوندیں گریں، مجال تو ہے کہ کسی عورت کا چراغ بجھے۔ ... کئی بار سلیم نے سوچا۔ کسی عورت کو دھنگا دینا چاہئے۔ شاید اس کا چراغ بجھ جائے

شاید چراغ بجھ جائے۔ ... وہ خوف سے کانپنے لگا۔

اور پھر تیزی سے بھاگا وینکٹ ریڈی کے کھیتوں کی طرف۔ چپکے چپکے وہ کھیتوں کے کنارے والی جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ اسے یاد تھا کہ شام کو وینکٹ ریڈی کے ہاں سے پیچ کے تھیلے بنڈیوں میں بھر کے آئے تھے تو اس کے بڑے بھائی مراد نے انہیں جھونپڑی میں کس طرف رکھا تھا۔ وہ نیچے جھکا۔ دانتوں سے جلدی جلدی اس نے ایک تھیلے کو کاٹا اور اپنی گود میں بیج بھرنے لگا۔ واپس جانے کو پلٹا تو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ ... رکھوالا اٹھ گیا۔

...دونگلو...دونگلو

چور...چور...” رکھوالے کی آواز سناتے میں دور تک چلی گئی جنگل کی ہوائیں چاروں طرف پکارنے لگیں...  
...دونگو...دونگو

... پہاڑوں کے پیچھے سے پوچمّا نے اپنے خوفناک دیدے چمکائے ... دونگو

دونگو... کھیتوں کے رکھوالے اٹھ بیٹھے۔ صبح کے مدھم سے دھند لکے میں انہوں نے چاروں طرف دیکھا... چودہ پندرہ برس کا ایک لڑکا کھیتوں کی منڈیروں دوڑ رہا تھا۔

ناج کے دانوں کو گود میں سنبھالے ہانپتا ہوا سلیم اپنے کھیت کے بیج میں آکر رُک گیا۔ ڈر کے مارے وہ کانپ رہا تھا۔ اس کے چھوٹے سے کھیت میں ابھی تک ہل چلا تھا۔ نہ صفائی ہوئی تھی... کون کرتا؟ بڑا بھائی مراد، ریڈی کے کھیتوں پر کام کرتا تھا۔ باواوینکٹ ریڈی کے ہاں رہن تھا۔ اب وہ اپنی ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر کھیت کی فلائی ہوائی کرتا تھا۔ کسی سے ادھار میں بیل مانگ لیتے۔ پھر بیج کا جھگڑا ہوتا۔ ہر سال وینکٹ ریڈی بیج دینے پر اماں سے تو تکار کرتا تھا۔ ایک پائیلی بیج کے بدلے پانچ پائیلی اناج واپس کرنا پڑتا تھا۔ تو اب بچا کیا... مشکل سے دو ڈھائی تھیلے جو پیلی جوار ہوتی تھی۔ کیونکہ ان کے کھیت میں گو بری پڑتی نہ پانی دیا جاتا تھا۔ پودے زمین سے اٹھتے ہی جھک جاتے تھے۔ جیسے وینکٹ ریڈی کے کھیتوں والے سرسبز شاداب پودوں کو دیکھتے ہی باوا کی طرح ماتھا ٹیک دیتے ہوں۔ وینکٹ ریڈی کے کھیتوں کے لئے سرکاری دفاتروں سے لوگ آکر گو بری ڈالتے تھے۔ پانی کا انجن بجلی سے چلتا۔ بین پچیس مزدور اس نے رہن رکھے تھے، جو دن رات کھیتوں کا کام کرتے۔

دس گیارہ برس کا سلیم بھی اپنے کھیت پر بڑی محنت کرتا تھا۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ اصل بات بیچوں کی ہے۔ ریڈی انہیں وہ بیج نہیں دیتا تھا جو وہ خود اپنے کھیتوں میں ڈالتا ہے۔ اسی لئے رات اس نے سوچ لیا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے وہ وینکٹ ریڈی کے کھیتوں والے بیج چڑا کے اپنے کھیتوں میں ڈالے گا۔

اچانک بادل زور سے گرجے اور پہاڑیوں کے پیچھے پوچمّا کے دیدے پھر چمکے۔

ہستی مستی کے دانے سرانا گئے اماں۔ ہر دم اللہ ہو، اللہ ہو۔

ڈر کے مارے سلیم کی گود میں سے اناج کے دانے نیچے گر پڑے... دُبا پتلا گھٹے

...ہوئے سر والا سلیم کھیت کے بیج میں یوں کھڑا تھا۔ جیسے ریڈی کے دربار میں طلبی ہوئی ہو

...اس کے سر پر بوندیں گرنے لگیں اور گالوں سے بہنے والے آنسوؤں کے ساتھ کھیت کی سوکھی مٹی میں مل گئیں

.. سالے چورسالے چور تیری ماں کیسالے چور تیری ماں کی

اللہ اکبر... اللہ اکبر... مولوی صاحب کی کانپتی ہوئی آواز زمین و آسمان کو دہلانے لگی۔

...دونگلو...دونگلو... ایک گوا چیختا ہوا اس کے سر پر سے گزر گیا... آج کھیتوں میں بیج پڑ رہا تھا

سلیم کے آس پاس دور تک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ دھوپ اب نیچے اتر گئی تھی سلیم کو ڈرانے والے سیاہ بادل جانے کدھر چلے گئے۔ مگر سلیم کے دل پر چھائے ہوئے بادل اور گہرے

ہو گئے تھے۔ بیج بھی نہ ملے اور چوری کا الزام بھی لگا۔

شاید رکھوالے نے اسے دیکھ لیا ہو۔ اب وہ باوا سے کہے گا۔ ممکن ہے ریڈی سے بھی کہہ دے۔ خوب پٹائی ہوگی... شاید اماں بیج میں آکر اسے چھڑالے۔ مگر اماں پوچھے گی، صبح سے کہاں تھا

چلو جنگل سے لکڑیاں توڑ کے گھر لے جاؤں۔ اماں خوش ہو جائے گی۔



وہ ایک سوکھے سے پرانے پیڑ پر چڑھا تو ایک کوا اسے دیکھ کر چلاتا ہوا بھاگا۔

‘ ‘ ‘...دونگلو...دونگلو’

یہ سالا وہی کوا ہے۔ سلیم نے غصہ میں دانت پیس کر کہا۔ اور پیڑ کی ایک موٹی سی شاخ پر لپٹ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اس کے سامنے دور دور تک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جڑی بوٹیوں والے جھاڑوں کے پھولوں کی کڑی کی مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں ابھی تک خنکی سی تھی۔ چیکٹ پلی کے لوگ کہتے ہیں کہ کسی اجنبی سے انتقام لینا ہو تو اسے اس جنگل میں چھوڑ دو جہاں سے باہر نکلنے کا راستہ کبھی نہ ملے گا۔ یہ جنگل گاؤں والوں کا نگہبان بھی تھا اور دشمن بھی۔ اس جنگل کی جڑی بوٹیاں چننے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ چھوٹے بچے اور بیکار نو جوان دن بھر یہاں لکڑیاں کانتے ، بیر ، چرونجی ، املی ، سینٹا پھل اور جنگلی پھل توڑ کر کھاتے۔۔۔ پھر کسی دن شور اٹھتا کہ ایک بچے کو کولا ( گیڈر ) لے گیا۔۔۔ یا کسی عورت کو سانپ نے ڈس لیا۔۔۔ دُور گاؤں کا حکم پھر جنگل میں آکر کوئی بوٹی ڈھونڈ تاکہ سانپ کے زہر سے بے ہوش ہو جانے والی عورت آنکھیں کھول کر اٹھ میٹھتی گاؤں میں قحط پڑتا تو اسی جنگل کی پھل پھلاری کھا کے وقت کٹتا تھا۔ اسی لئے چیکٹ پلی کے لوگوں کے لئے یہ جنگل ماں کی طرح تھا کہ حفاظت بھی کرتا اور سب اس سے ڈرتے بھی تھے۔

جہاں پر جنگل ذرا چھدرا ہونا شروع ہوا تھا ، بس وہیں پہ پتھر پھوڑنے والے وٹروں اور بنجاروں کی جھونپڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

اونچے نیچے ٹیلوں پر بنی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں دور سے ایسے لگ رہی تھیں جیسے رنگیں کاغذوں پر کسی نے سیزی بنائی ہو۔ ان جھونپڑیوں کے آگے نیم یا آم کے گھنے پیڑ تھے ، جن کے نیچے بنجاروں کے بچے اور کہتے ، مرغیاں کھیلتی تھیں۔ یہ پیڑ ان کے باورچی خانے بھی تھے اور سونے کے کمرے بھی۔ کیونکہ وہ جھونپڑی تو اتنی چھوٹی نیچی سے بناتے ہیں کہ بیٹھ کر بھی اندر جاؤ تو سر جھکانا پڑتا ہے۔ ویسے بھی بنجارے اور وڈر لوگ کسی ایک جگہ ٹک کر نہ رہتے تھے۔ جہاں کام ملتا وہیں اپنی بستی بسا لیتے تھے۔ کام ختم ہوتا تو جھونپڑی کی ٹٹی لپیٹ کر سر پر رکھ لیتے اور اونچے نیچے ٹیلوں کو پار کر کے کسی اور جنگل میں جابستے۔ ایک سیاہ مٹی کی ہانڈی ، ایک مٹی کی رکابی، ایک لکڑی کی ڈوئی ، ایک ٹوکرا اور ایک بکری کے بالوں سے بناسیہ کمبل۔۔۔ ہر خاندان کی زندگی کا یہی کل سرمایہ ہوتا ہے، جس میں وہ جاڑا ، گرمی ، برسات گزار دیتے ہیں۔

سلیم کو بنجارنیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ ان کے رنگ برنگے کپڑوں پر لگے ہوئے ہزاروں آئینے اسے بہت اچھے لگتے۔ کبھی کبھار وہ کھیلتا ہوا بنجاروں کی جھونپڑیوں کی طرف جانکالتا۔

شام کے وقت وہ لوگ پتھروں کے چولہے بنا کر چاول اُبالتے تھے۔ اور پھر سیندھی پی کر خوب اودھم مچاتے۔ ان کے ناچنے گانے کی آوازیں گاؤں تک آتی تھیں۔ بنجارنیں اپنے کانسی کے زیور بجا کر تا چتیں۔

گنگی گاؤں کو جاتی ، گنگی شام کو آتی

عقلدار کا ڈیرا ، بھرے گاؤں کا پھیرا

گنگی چوروں کا ڈر ، گنگی چوروں کا ڈر

لو ، بنجارے آگئے۔۔۔ گاؤں والے چوکنے ہو جاتے ہیں۔۔۔ جانے کتنے ڈا کے پڑیں

گے۔۔۔ کتنی چوریاں ہوں گی۔ نوابوں ، کنبیویوں ، ریڈیوں اور پٹیل پٹواریوں کے ہاں راتوں کو حفاظتی انتظام ہو جاتے تھے۔ کیونکہ راتوں کو ٹولیاں بنا کے یہ لوگ چوریاں کرتے تھے۔ اور جب سے نظام کی فوج کے ظلم بڑھنے لگے تو حیدر آباد میں بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں نے یکجا کر کے کھیت مزدوروں اور کسانوں کو متحد کرنا شروع کیا تھا۔ تب ہمیشہ باغی نو جوان ان کے بنجاروں کے ساتھ مل کر جاگیرداروں۔۔۔ اور ساہوکاروں کے گھروں میں ڈاکے ڈالتے تھے۔ ان لٹیروں کی پناہ گاہ بھی چیکٹ پلی کا گھنا جنگل تھا۔ جہاں شہر کی پولیس کبھی مجرموں کا سراغ نہیں لگا سکتی تھی۔

اب کانگریس کا راج آیا تو بھی سب پیسے والے ریڈی اور سا ہو کا راس جنگل پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ کچھ قاتل لٹیرے آج بھی ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اس بات کی اطلاع فوراً مل جاتی تھی کہ گاؤں کا کوئی لڑکا ان وٹروں یا بنجاروں سے تو نہیں ملتا۔

اب پوجما کا برا مندر دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ مندر تک جانے کے لئے پہاڑی پر جو کچی پگڈنڈی تھی وہ لوگوں کے قدموں کے نشانوں سے دھل دھل کر دور سے یوں چمک رہی تھی جیسے وینکٹ ریڈی کی بیوی رتنما کی سیندور بھری مانگ چمکتی ہے۔ رات کو روشنی سے جگمگا تا ہوا دیول گاؤں کے ماتھے پر ٹیکے کی طرح سجا ہوا لگتا ہے۔ پوجما کا یہ دیول تو سچ مچ چیکٹ پلی کے ماتھے کا ٹیکہ ہے۔ اس مندر کی شہرت تو حیدر آباد تک پھیلی ہوئی ہے۔ سات گاؤں کے لوگ اس دیول میں کالی ماتا سے آشیرواد لینے آتے ہیں۔ سلیم بھی پوجما کے دیول کو جاتا تھا۔ وہاں پوجاکے لئے پھوڑنے والے ناریل اور مٹھانی بچوں اور فقیروں میں بانٹی جاتی تھی تو وہ بھی ہاتھ پھیلاتا تھا۔ کئی بار اماں نے کہا تھا۔

‘ ‘ ‘...دیول کا پرشاد نکو کھا... گناہ ہوتا’’

مگر اس سے تو ابھی تک گناہ نہیں ہوا تھا۔ گاؤں میں جب ہبضے یا چیچک کی بلا نہیں آتی تھیں تو سب ہندو مسلمان مل کر پوجما کی پوجا کرتے ہیں۔ اماں کی آدھی رات کو قربانی کے بھینسے لے آتے ، خوفناک دھن میں دھبڑا اور سنکھ بجاتے پجاری پوجا کا گھڑا لے کر نکلتا تھا تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاتے تھے۔ کہتے ہیں اس پوجا کی راہ کاٹنے والا کبھی نہیں بچتا۔ دوسری رات اس پر بھاری ہوتی ہے۔ مگر ایک بارسلیمچیکے سے باہر نکل گیا۔ اور پیچھے پیچھے چلتا دیول تک پوجا کے جلوس کے ساتھ چلا گیا۔

...پوجا کے وقت پوجما اس آدمی پر آتی تھی جو سر پر پوجا کا گھڑائے ہوا تھا

دھبڑے اور ڈھول کی آواز بونے لگی۔ گھڑے والا نیم کے پتے ہاتھ میں تھامے تیزی سے ناچنے لگا۔ لوگوں نے اسے زیر دستی تھام کر گھڑا دیوی کے آگے رکھ دیا۔ پھر وہ آدمی غضبناک چہرے لئے بھینسے کا نرخہ دانتوں سے کاٹنے لگا۔ پجاری دُور ہٹ گئے۔ دھبڑا چپ ہو گیا۔ سب منتظر تھے کہ بھینسے کو مارنے والا زمین پر گرتا ہے یا اپنے خون آلودہ دانت کھول کر ایک اور جان مانگتا ہے۔ ایک اور جان مانگنے کا مطلب تھا کہ انسانی جان کی قربانی لئے بغیر پوجما گاؤں سے نہیں جائے گی۔ مگر بھینسے کی قربانی پر اس رات وہ آدمی چپ چاپ زمین پر لیٹ گیا ، اور لوگ خوشی کے مارے زور زور سے چلانے لگے۔ چلانے والوں میں سلیم بھی تھا۔ کالی ماتا کی جئے... اور جب کالی ماتا کے اشنان والا پوٹر پانی انہوں نے سب کی ہتھیلیوں پر ڈالا تو سلیم نے بڑھ کر پانی ہاتھ پر لیا، پھر ماتھے سے لگایا۔ سینے پر چھڑ کا اور بھا گا گاؤں کی طرف۔

دھوم مچانے اور چیخنے چلانے کا اسے بڑا شوق تھا۔ چاہے محرم کے علم بیٹھنے کا شور ہو یا پوجما کی پوجا۔ وہ باجے والوں کے ساتھ ساتھ ناچتا گا تا پورے گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ خاص طور سے محرم کے دس دنوں تک تو اسے اپنے تن بدن کا ہوش نا رہتا تھا۔ امام باڑوں کو دھونا ، چونا ڈالنا علم بٹھانا ، شام کو گڑ کا شربت بانٹنا۔ منت لے کر آنے والی عورتوں کے سر پر مورچھل پھیرنا۔ پھر راتوں کو صابر میاں اور مستان کے ساتھ بیٹھ کر مرثیے پڑھنا، ہر جگہ وہ پیش پیش رہتا ، لیکن اسے محرم میں مرثیے پڑھنے سے زیادہ ہندو لڑکوں کے ساتھ ”بے دش“ کہیلنا اچھا لگتا تھا۔ ”بے دش“ ایک ناچ ہے، جس میں ہاتھوں میں دو لاٹھیاں تھام کر ایک حلقہ کے اندر ناچ لڑکیوں کو بجا بجا کر ناچتے ہیں اور دو آدمی حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا قصہ رو رو کر سناتے ہیں۔ سب ہندو مسلمان عورتیں گھروں سے باہر کھڑے ہو کر یہ ناچ دیکھتیں، اور کمزور دل والی عورتیں ساڑی کے پلو سے آنسو یو مجھنے لگتی تھیں۔

ساری دُنیا کی خاک چھاننے کے بعد پسینے میں ڈوبا سلیم گاؤں کی طرف جانے لگا۔

اب اسے یقین تھا کہ مراد بھائی مزدوری پر چلا گیا ہو گیا۔ گوری بی اور غوثیہ بی کھیتوں پر ہوں گی۔ شاید اماں گھر میں ہو اور چولہا لپ رہی ہو۔ اماں کو جانے چولہا لپینے کا اتنا شوق کیوں تھا۔ ان کے ہاں کئی کئی دن چولہا نہیں سلگتا تھا۔ باواریڈی کے ہاں سے جھوٹا کھانا لا کر سب بچوں کا پیٹ بھر دیتا ہے۔ مگر احمد بی روز چولہا لپیٹی ہے۔ جیسے دس دیگیں اتارنے کے بعد اس کا سارا باورچی خانہ ہڈیوں بوٹیوں سے سنا پڑا ہو۔

وینکٹ ریڈی کے گھر کے سامنے سے گزرتے وقت اس نے دیکھا کہ اس کی خوبصورت بیوی رتنما کسی بھکاری کو چاول دے رہی ہے۔ چاول دیکھ کر اس کا جی للچایا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔ دادی بھی بھو کی پڑی اس کا انتظار کر

رہی ہوگی کہ شاید سلیم رتناسے باسی کھانا لے کر آئے۔ روز دو پہر کو دادی اسے زبر دستی ریڈی کے ہاں بھیجتی ہے۔ جھوٹا کھا نالانے کو۔

میں نہیں جاتا... سلیم کو بے حد غصہ آتا ہے۔

کیا میں بھکاری ہوں کہ روز ساہوکار کے دروازے پر جا کر بھیک مانگوں۔ اس کی ماں مجھے جھڑکیاں دیتی ہے۔ ”

”بہت سے کام لگا دیتی ہے۔“

تو کیا ہوا بیٹا...“ اندھی دادی رسان سے کہتی ہے ”

”ہم ان کے غلام ہیں۔ ان کی دنیا سے ہمارا پیٹ بھرتا ہے۔ ان کا کام کرنا تو ہمارا فرض ہے۔“

چپ بڑھی... سلیم کا جی جل جاتا تھا۔ جھوٹن دینے والوں کو دنیا لو کہتی ہے

”تو ہو گی ان کی غلام... میں کیوں غلام بنے لگا۔“

غلام کیوں نہ ہوا... بڑھی دادی بھی بکو اس کئے جاتی۔“

”تیرا دادا ان کی غلامی کرتا تھا۔ تیرا باپ ان کے ہاں رہن ہے۔“

اُوں اُوں... سلیم نے غصہ کے مارے بڑھیا کا منہ چڑایا اور اس کی لاثھی اٹھائی ہاتھ میں۔“

اب چپ بیٹھتی یادوں ایک لاثھی...؟

اب اسے دادی یاد آنے لگی۔ اگر وہ صبح دادی کی بات مان لیتا تو اس وقت یہ چاول اسی کول جاتے۔ اس نے وینکٹ ریڈی کے گھر کے پاس پہنچ کر اس پر تھوک دیا پھر رتنآ کو دیکھ کر گھبرا گیا... رتنآ اس کو دیکھ رہی تھی۔

ریڈی کے بے حد اونچے دروازے میں وہ ایک چھوٹی سی گڑیا کی طرح کھڑی تھی وینکٹ ریڈی کا دروازہ بہت اونچا تھا۔ پیتل کے کنڈے اور پیتل کے بیل بوٹے بنے تھے کواڑوں پر۔ دس آدمی بھی مل کر توڑنا چاہیں تو نہ تو ڈسکیں۔ وینکٹ ریڈی نے سینکڑوں بورے اناج اور پورے گاؤں کی عورتوں کا سونا چاندی رہن رکھا ہے اس گھر میں۔ اسی لئے تو گاؤں میں جتنے ساہوکاروں، پولیس والوں، جاگیرداروں کے مکان تھے، ان کے دروازے بہت اونچے تھے، ایک بار رتنآ نے چاول نہیں دیئے تو غصہ کے مارے سلیم کا جی چابا دروازہ توڑ ڈالے۔ مگر ایک لوہے کی پتی کو اپنی جگہ سے سرکا نہ سکا۔

چاول لے گا... بھوکا ہے کیا...؟“ رتنآ نے اسے چپ چاپ کھڑے؟ دیکھا تو پوچھا۔ پھر وہ اپنی لمبی چھری کمر ”

لہراتی اندر گئی تو اس کے بڑے سے جوڑے جوڑے کے گرد لگی ہوئی گیندے کے پھولوں کی بینی سلیم کو بہت اچھی لگی۔ جوڑے کے بیچ میں سونے کا پھول چمک رہا تھا۔

آج چاول بہت بچے تھے۔ میں نے تیری بڑی راہ دیکھی۔ پھر بھکاری کو دیدیے۔“... رتنآ نے اپنی سرخ ہینڈ لوم ساری ”

کا پلو سر پر سنبھال کر کہا۔

سلیم کو رتنآ بڑی اچھی لگتی تھی۔ وہ عمر میں سلیم سے کچھ ہی بڑی ہوگی۔ گوری گوری تیکھے نین نقش والی۔ اس کی مانگ میں ہر وقت سیندور لگا رہتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کو ہلدی لگاتی۔ ماتھے پر خوب بڑا بٹو... کانوں میں سونے کی گنتیاں اور گلے میں... گلے میں جانے کتنے ہیرے موتی۔ چاند ستارے جھلملاتے تھے۔

سلیم جب بھی رتنآ کی طرف دیکھتا تھا۔ اس کے سارے رنگ گھل جاتے اور وہ گھبرا کے رتنآ کے گورے پانوں کو گھورنے لگتا۔ سلیم کی نظر اس کے پانوں پر تھی۔ جھوٹی پترولی سے چاول پھسل کر سلیم کے ہاتھوں سے رتنآ کے پانوں میں یوں جا پڑے جیسے وہ پوچما کے دیول میں پوجا کر رہا ہو۔

...ایو اماں، تو نے تو سب چاول گرا دیئے۔ اب کھانا نہیں ہے۔ جا گھر کو...“ اور پھر پیچھے مڑ کر رتنآ بولی

”ہمارے گھر میں کاج ہونے والا ہے تیری اماں اور بہنوں کو بلانا، کل صبح سے آجائیں۔“

اچھا اچھا...“ سلیم نے زور سے سر ہلایا۔“

رتنما! اور تنما!...“ وہ آگے بڑھ کر پکارنے لگا۔“

کیا ہے رے...؟“ رتنّا نے بڑے ناز سے مڑ کر دیکھا۔“

‘ ‘ کیا میں بھی آؤں؟ کوئی کام ہے کیا...؟“

‘ ‘ ہؤ، آجا...“ اس نے اپنے گنتیوں والے کان ہلا کر کہا... اور پھر اسے غور سے دیکھ کر بولی...“ کیا بات ہے؟“

رتنما... کیا میں جاؤں.....؟“ اس نے بڑی فریادی نظروں سے رتنّا کو دیکھا۔“

ہؤ...“ اس نے گردن ہلائی اور چاروں طرف دالانوں میں رکھے ہوئے بوروں کے نیچے کہیں دب گئی۔ وینکٹ ریڈی ” کے گھر میں چاروں طرف دالان ہی دالان تھے، اور سب دالانوں میں اناج کے بورے بھرے ہوئے تھے۔ جانے یہ لوگ کتنا کھانا کھاتے ہیں۔ ایک دن سب بچے بھوکے پڑے تھے تو سوتے سوتے چونک کر سلیم نے اماں سے پوچھا۔

اماں کومٹی کے گھر میں اتنے بہت سے تھلے بھر کر جوار ہے۔ وہ ہم لوگوں کو ایک تھیلا کیوں نہیں دیتا؟“

چپ پاگل پوٹے...“ اماں کو ہنسی آگئی۔“

یہ تو کیسی ہولے پن کی باتیں کرتا ہے رے۔ کوئی سنے گا تو تیرے کو دیوانہ بولینگا نا۔ کہیں سا ہو کار بھی غریبوں کو تھیلے بھر کر کے جوار دیتے ہیں...؟

کیوں نہیں دیتے...“ سلیم سوچتا... شاید اس لئے کہ ہم لوگ وہ“

چاول ایک ہی دن میں کھاڈالیں گے۔ پھر سارے پیٹ پھٹ جائیں گے۔ سلیم کو پکا یقین تھا کہ اگر کبھی گھر میں ایک تھیلا چاول آگئے تو وہ سب چاول ایک ہی دن میں اس کے بہن بھائی کھالیں گے۔ جانے لوگوں کے ہاں رونی سالن کیسے بچ جاتا ہے۔ ان کے ہاں تو کبھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ بچا۔

سلیم کے دادا کے پاس سو (۱۰۰) ایکٹر کھیت تھے جو اس کے چھ بیٹوں میں بٹے۔ پھر ان بیٹوں کی شادیاں ہوئیں۔ ان کی ضرورتیں بڑھیں۔ سلیم کے دادا نے ہر بہن کی شادی پر ایک کھیت وینکٹ ریڈی کے باپ کے پاس رہن رکھا۔ اور جب اس کی دادی مری تو وہ پانچ سو روپے کے عوض ایک برس کے لئے خود ریڈی کے ہاں رہن ہو گیا۔ ایک برس پہاڑ ہو گیا۔ کاتے نہ کٹتا... اس کی بیوی چھوٹے بچوں کو لے کر کام کرتی، مگر پھر بھی وہ سا ہو کار کا پیسہ واپس نہ کر سکے... رہن کی معیاد بڑھتی گئی۔ بچے ہوئے کھیت بھی رہن رکھ کر احمد بی نے گھر کا خرچ چلایا۔ پھر مراد کی شادی کا وقت آیا تو مراد کو بھی تین سو روپے کے لئے وینکٹ ریڈی کے ہاں رہن ہونا پڑا... اس کی بیوی نورّا بڑی محنتی لڑکی تھی۔ فصل کے بعد جب صابر میاں اینٹوں کا بھٹہ لگاتے تھے تو نورّا بھی اینٹوں کو اٹھانے کی مزدوری کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ مراد کو ابھی تک نہیں چھڑا سکی تھی... جب گھر کے کام کرنے والے مرد بن ہوں تو خیر و برکت ہی اُٹھ جاتی ہے۔ احمد بی کے گیارہ بچے ہی کیا کم تھے کہ سال ہونے سے پہلے مراد بھی ایک بچے کا باپ بن گیا۔ کھانے والے منہ اور بڑھ گئے... مراد کا باپ مستان، ریڈی کا کام کر کے گھر آتا تو اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ گیارہ بچوں سے کیسے نبتے ایک کھیت بچا تھا جس پر احمد بی کے ساتھ سب مل کر محنت کرتے تھے۔ پھر بھی چار پانچ تھیلوں سے زیادہ پیلی جوار نہ نکلی تھی۔ ادھر اس کی بیوی احمد بی کی فصل سد الہلہاتی رہی۔ ہر سال ان کے ہاں ایک بچے کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ مستان جب کبھی یاد کرتا کہ اس کی شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں تو بچوں کی تعداد گن لیتا تھا۔ مگر ایک بار یہاں بھی گڑ بڑ ہو گئی۔ اس کی اماں کہتی تھی اس کی شادی کو دس سال ہوئے ہیں۔ اور بچے گئے تو پورے گیارہ... جب یہ مسئلہ کسی طرح حل نہ ہوا تو اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ بچے کیچڑ میں رینگتے ہوئے کیڑوں کی طرح کلبلا تے پھرتے۔ اور مستان خوشی کے مارے سر اونچا کر کے گاؤں میں چلتا۔ بڑی بھاگیہ وان ہے میری بیوی۔ گیارہ بچوں کی ماں ہے... غریب کسان کے ہاں تو بچے ہی دولت ہیں، جو بغیر کسی خرچ کے مفت میں مل جاتے ہیں۔ تین

چار برس تک وہ ماں کی جان کو جونک کی طرح چوستے رہتے۔ پھر دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ دانا دُنکا چن کر پیٹ بھر لینا سیکھ جاتے۔ ان کے پیٹ بھر کھانے اور تن ڈھانکنے کی کسی کوفکر نہیں ہوتی ہے آٹھ دس برس کے ہوتے ہی وہ ماں باپ کا ہاتھ بٹانے کھیتوں پر جاتے ہیں۔ اگر باپ رہن ہے تو اس کے ساتھ ساہوکار کا کام کرنا ان پر بھی فرض ہو جاتا ہے۔ اُپلے تھوڑے ، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ، گائے بھینسوں کو چرانے جنگل لے جاتے ، ہلدی مونگ پھلی چنتے ، دوسروں کے کھیتوں پر مزدوری کرنے جاتے۔ جتنے بچے زیادہ ہوں اتنا ہی کام آسان ہو جاتا ہے۔ اب وہ اونچے بنگلوں کے باسی تو ہیں نہیں کہ آدمیوں کو گن کر کھانا پکا ئیں۔ روٹی تو اتنی ہی پکے گی جتنا آٹا میسر ہے۔ بچے زیادہ ہوں تو سب مل بانٹ کر کھا لیں گے۔ اس لئے مستان ہر وقت اپنی بیوی سے کہتا تھا۔

ارے پانچ لڑکوں کا باپ ہوں۔ کیا سب مل کر مجھے ساہوکار سے نہیں چھڑا لیں گے۔ بس دو چار برس کی بات رہ گئی ” ہے۔“ مگر یہ دو چار برس جانے کتنے لمبے ہو گئے تھے کہ کتنے ہی نہ تھے۔ بڑا لڑکا مراد بیس برس کا ہو گیا تو اس کی شادی کی فکر میں احمد بی گھلنے لگی۔ خود مراد نو رآ پر بُری طرح مرتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اتنی خوبصورت نوراً سے اس نے جلدی سے بیاہ نہ کیا تو گاؤں کا کوئی نہ کوئی لڑکا اسے جھپٹ لے گا۔ وہ جلدی سے باپ کے ساتھ جا کر پانچ سو روپے کے بدلے وینکٹ ریڈی کے ہاں رہن ہو گیا۔ اب دونوں باپ بیٹے ریڈی کا کام کرتے تھے۔ اس لئے گھر کی ذمہ داری سلیم پر تھی۔ مگر مستان صبح ہوتے ہی سب بچوں کو اسکول کی طرف ہانک دیتا تھا۔ مستان کا دادا مسجد کا پیش امام تھا۔ اس کی قابلیت کے قصے آج بھی سارے گاؤں کو یاد تھے۔ مستان نرا جاہل تھا۔ مگر وہ نہ پڑھ سکا تو کیا ہوا۔ اس کے بچے ضرور دادا کا نام روشن کریں گے۔ سب لڑکے لڑکیاں اسکول کی طرف جاتیں اور آدھے راستے سے لوٹ آتیں۔ مگر سلیم رات دن کتاب آنکھوں سے لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ ایک دن تو احمد بی کو بڑا تعجب ہوا جب سلیم نے ایک پھٹے ہوئے اخبار کی پوری خبر فر فر پڑھ کر سنادی۔ حالانکہ اسے سلیم کی پڑھائی سے بڑی نفرت تھی۔ تیرہ چودہ برس کا سیانا لڑکا ، یہ دن محنت مزدوری کرنے کے ہیں ، ایا نوابوں کی طرح ٹانگیں پसार کے کتابیں پڑھنے میں وقت گنونا ہے

ا سے کام پر کیوں نہیں لگاتے بھائی؟“ مستان کا بھائی ابو خاں کہتا تھا۔ ابو خاں بھی ایک سا ہو کارنر سا ریڈی کے ” ہاں رہن تھا۔ دن رات محنت مزدوری کرتا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بیوی ساہوکار کا کام کرتے تھے۔

وینکٹ ریڈی کے ہاں اس کے بیٹے سری نو اس کا منٹن ہونے والا تھا۔

اس لئے مستان کی بیوی احمد بی ، اس کی دونوں بڑی لڑکیاں ، گوری بی ، خواجہ بی اور سلیم کو بھی ان کے گھر کا کام کرنا تھا۔ وہ سب مل کر چاول صاف کریں گی۔ مرچ مسالے کو ٹیں گی۔ گھر پر رنگ اور چونا ڈالیں گی۔ جھوٹے برتن دھولیں گی۔ رتنائے سلیم کو تو اندر باہر کے اتنے کام لگادیئے تھے کہ وہ رتنائے گرد ہی منڈلائے جار ہا تھا۔ ریڈیوں کے ہاں چھوت

چہات نہیں ہوتی، نہ وہ لوگ گوشت کا پر بیز کرتے ہیں۔ اس لئے گاؤں میں امیر ریڈیوں کے ہاں غریب مسلمان کام کرتے ہیں۔ گھروں میں ان کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود وینکٹ ریڈی کی ماں پوشما کو احمد بی اور مستان سے بڑی نفرت تھی۔ پورا خاندان مفت کی کھانا ہے۔ صرف باپ بیٹے کو رہن رکھا ہے، مگر ہر وقت بچے ہاتھ پھیلانے کھڑے رہتے ہیں۔ اور یہ سلیم چھوکرا تو بڑا مغرور ہے۔ کبھی جو بات سنے... جانے کیوں رتنا اسے گھر میں گھسا لیتی ہے! اسی لئے پوشما دالان میں چوکی ڈال کر بیٹھ گئی تھی، سب کی نگرانی کرنے... جب کبھی رتنا چولہے کے سلیم سے کام لینے اندر جاتی تھی تو پوچھنا چلاتی۔

اری رتنا دیکھ تو یہ احمد بی کتنی مرچ لے گئی ہے کوٹھے... ارے او چھو کرے! چو کے کی طرف کیوں جا رہا ”  
‘ ’ بے، بابر بیٹھ خواجہ بی ادھر آ... دیکھوں تو نے پلو میں کیا چھپایا ہے...؟

پوشما جانتی تھی ان کمینوں کا چاہے کتنا ہی پیٹ بھرو۔ یہ چوری ضرور کریں گے وینکٹ ریڈی آنگن میں چوکی پر بیٹھا حجام سے بال کٹوار ہا تھا۔ اس نے حجام کے آئینے میں اپنی صورت دیکھنا چاہی تو خواجہ بی نے سینے سے آچل ہٹا کر بتایا۔

لودیکھ... لو میرے پاس کیا ہے...؟“ چوری کا الزام لگا تو خواجہ بی سسکنے لگی۔

وینکٹ ریڈی نے دیکھا... اس کے پاس بہت کچھ تھا... وہ تو مالا مال نظر آرہی ہے۔

ارے...؟ کیا فصل تیار ہوگئی...؟“ اس نے چونک کر اپنی مانسے پوچھا۔

اور کیا... اب تیار ہی سمجھو...“ پوشما نے اپنے پان کی تھیلی کھولتے ہوئے کہا۔

اور مجھے خبر ہی نہیں... پاگل ہوں میں بھی۔“ وینکٹ ریڈی نے پلٹ کر خواجہ بی کو غور سے دیکھا... اور تھوک ”  
نگل کر پوچھا۔

‘ ’ یہ کون پوٹی ہے ماں... گھر میں کیوں آتی ہے...؟

ارے یہ تو مستان کی چھوگری ہے جی... ہمیشہ گھر میں آتی ہے نا۔ اب اتنا کام پڑا ہے تو کیا کرائے کے آدمی بلواؤں ”  
؟“ پوشمانے سروتے سے چھالیہ کاٹتے میں کہا۔

ہاں ہاں ٹھیک ہے...“ وینکٹ ریڈی آنگن میں دوڑ دوڑ کر جھاڑو دینے والی خواجہ بی کو اپنے آئینے میں گھیرتا ”  
رہا۔

“کرنے دو... ہاں ماں! ایک بات یاد آئی۔ کھیتوں والے گھر میں بھی تو صفائی کرانا ہے۔“

اے چھوگری... ادھر آ... یہ کنجی لے اور جھاڑ بھی لے کر کھیتوں والے بنگلے پر جا۔ پورے گھر میں اچھی طرح ”  
صفائی کرنا۔“ اس نے دیوار سے تنگی ہوئی کنجی اتار کے زور سے خواجہ بی کے سینے پر ماری۔

اچھا... اچھا...“ خواجہ بی نے بڑے ادب سے سر ہلایا۔ کنجیوں کا جھیلہ ہاتھ میں تھام کر خواجہ بی خوشی سے کھلی ”  
جاری تھی۔ اس دیوڑھی میں تو بہت قیمتی سامان ہے۔ مستان نے بھی سنا تو بہت خوش ہوا۔ وینکٹی صرف اسی پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ اس کی اولاد پر بھی اسے اعتماد ہے۔ اسی لئے تو اتنے بڑے گھر کی کنجیاں خواجہ بی کے حوالے کر دیں۔ اگر وینکٹی کی ماں کو یہ سن لگ گئی تو وہ خود پہنچ جائے گی وہاں صفائی کروانے... وہ تو سب کو چور سمجھتی ہے۔

مستان خواہ بی کو دیوڑھی تک پہنچانے گیا تو آتے وقت اس کو سخت تاکید کی کہ خبردار جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔  
وینکٹی کے سامنے ہمیشہ کے لئے ناک نیچی ہو جائے گی۔

یہ دیوڑھی بالکل جنگل کے کنارے کھیتوں کے پاس تھی۔ کسی زمانے میں وینکٹی کا باپ اس دیوڑھی میں فصل کا اناج اکٹھا کرتا تھا۔ پھر آموں کے زمانے میں اس کے شہر والے دوست یہاں آکر ٹھہر تے تھے۔ چھوٹا سا گھر تھا، دو کمروں والا۔ اب

اس پر چونا ڈال کر وینکٹی نے اسے ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا۔ کیونکہ یہاں ہر مہینے حیدر آباد کی رنڈی سرتا کو وہ ٹھہرایا کرتا تھا۔ رتنّا سے کہتا فصلوں کا حساب کتاب کرنے جارہا ہوں۔

خواجہ بی نے اپنے پھٹے دوپٹے کا پلو کمر پر کسا اور طے کر لیا کہ آج تو وہ جھاڑو پونچھ کر سارے کمرے کو چمکا دے گی۔ سب سے پہلے وہ سرتاج کے سونے والے کمرے میں گئی۔ سوچنے لگی کہ وہ گوری کی رنڈی جانے یہاں کیسے سوتی ہوگی۔ مسہری کے سرہانے بہت بڑا آئینہ لگا تھا۔ ہاتھ میں جھاڑو تھا مے وہ اوندھی لیٹ کر آئینہ میں اپنا منہ چڑانے لگی اور چونک کر پیچھے بیٹھی۔ یہ کیا...؟ آئینے میں تو وینکٹ ریڈی کی صورت نظر آرہی تھی... وہ بڑے اطمینان سے مسہری کے ایک کونے پر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا اور خواجہ بی اچھل کر دیوار سے جاکرائی عورت کی چھٹی جس نے اسے اچانک کسی خطرے کا احساس دلایا اور وہ دروازے کی طرف بڑھی... مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔

اس نے آئینہ کی طرف دیکھا۔ اب وینکٹی اسے شیطان کی طرح نظر آرہا تھا۔ پھر وینکٹی نے اٹھ کر وہ کھڑکی کی بھی بند کر دی جہاں سے باہر کی ہوا اندر آرہی تھی۔ گھپ اندھیرے میں خواجہ بی کو کچھ سمجھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ ایک ایسے اندھے غار میں چلی گئی جس کا کوئی اور چہرہ نہایتھا... اس کی چیخیں باہر کھیتوں تک گونج رہی تھیں۔ بہت سی چڑیاں چہچہانا بھول گئیں۔ اور دیوڑھی کی منڈیر پر بیٹھا ہوا کو اچلانے لگا... دونگو... دونگو

بوڑھے رامیا نے ہل کو بیلوں کے کاندھے پر رکھتے ہوئے سوچا

اب کی بار بھی ساری فصل ستیا ناس ہوگئی... جانے کون راتوں رات سارا کھیت اجاڑ گیا... اب پھر ہل چلاؤ... بیج ‘ ‘ ڈالو

شام کو مستان خواجہ بی کو لانے دیوڑھی گیا تو وہ ایک کونے میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں اور پھٹی ہوئی ساری نے اسے ہر بات بتائی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے خواجہ بی کو سہارا دے کر اٹھایا۔

باوا... باوا...“ خواجہ بی کلیجہ پہاڑ کر رو پڑی اور باپ سے لیٹ گئی

چپ بیٹا... چپ بیٹھ... لوگاں سن لیں گے“... مستان ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ اس نے خواجہ بی کی آنکھیں ”پونچھیں۔ کپڑے ٹھیک کیے۔

اماں کو کچھ نکو بول... تیرے بھائی سن لیں گے... سمجھ گئی نا... جا اب تو خود گھر چلی جا۔ مجھے ریڈی کے ہاں ”بہت کام ہے۔“

خواجہ بی نے جلدی جلدی ریڈی کے گھر جانے والے باپ کو دیکھا۔ اماں ٹھیک بولتی۔ یہ تو ریڈی کا کتا ہے۔ یوں بھاگ رہا ہے جیسے ریڈی کو قتل کرنے جارہا ہو... ٹھہر ابھی جا کر مراد بھائی کو بولتی ہوں۔

وہ سسکیاں لیتی آگے بڑھی۔

اندر کی تو سامنے آی سلیم آنگن میں بیٹھا درانتی سے بھینس کا چارہ کاٹ رہا تھا۔ مراد کی بیوی نو رآ پاس بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔

بھائی جلدی اٹھ... یہ درانتی لے کر وینکٹی کا گلا کاٹ دے۔“

مگر وہ یہ بات نہیں کہہ سکی... وینکٹی کو مارنے کے بعد اسے بھی تو پھانسی پر چڑھنا پڑے گا... پھر بھابی میری جان کو رونے لگی۔ جیسے بڑی پھوپھو... جھوٹی پھوپھو روتی ہیں۔ ایک بار غصہ میں خواجہ بی کا دادا بھی اپنے مالک نواب صاحب پر لڑائی لے کر دوڑا تھا تو نواب صاحب نے اسے پھانسی کی سزا دلوائی تھی۔ ان کے پورے خاندان کا جینا دو بھر کر دیا۔ تب ہی مستان کو کہیں پناہ نہ ملی تو وینکٹ ریڈی کے قدموں میں آگرا... وینکٹ ریڈی کا باپ لچھیا تو ایک زمانے سے نوابوں کو لوٹ کر گاؤں کی سرداری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھٹ پانچ سو روپے نکال کر مستان کے ہاتھ پر رکھے اور پانچ برس کے لئے ربن رکھ لیا۔

تو صبح سے کہاں تھی...؟“ سلیم نے اسے گھور کر دیکھا اور درانتی سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔ احمد بی گھبرا گئی۔ ” کہیں وہ سچ مچ غصہ میں خواجہ بی پر ہاتھ نہ اٹھا دے اس لونڈے کے تو ناک پر غصہ دھرا ہے۔ اللہ رحم کرے۔

”تجھے معلوم نہیں کیا ریڈی کے ہاں کتنا کام ہے آجکل... ریڈی اپنا کچھ کام کروا رہا ہوگا۔

احمد بی جھٹ سے دونوں کے بیچ میں اکھڑی ہوئی۔ خواجہ بی نے کوئی جواب نہ دیا مگر سلیم کو جانے کیسی نظروں سے دیکھا کہ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا... وہ جیسے اچانک پتھر بن گیا۔ پہلے اس کے ہاتھ سے درانتی گری اور پھر وہ خود چکرا کے بیٹھ گیا۔

کیا ہوا... کیا ہوا...؟“ اس کی بھابی روتے ہوئے بچے کو پٹک کر جلدی سے اٹھی اور لیٹے ہوئے سلیم کا سر ” سہلانے لگی۔ خواجہ بی ابھی تک ایک کونے میں منہ میں پلو ٹھونسے چپ چاپ کھڑی تھی۔

ہوتا کیا...؟“ احمد بی نے پاس بیٹھ کر رسان سے کہا۔

ریڈی کے گھر کا کاج تو ہم سب کو مار ڈالے گا۔ اتنے سے بچے سے سارا دن لکڑیاں کٹواتی ہیں... تھک گیا ہے ” .....بیچارہ...“ اور پھر احمد بی نے خواجہ بی کو غصہ سے گھورا

تو نے اتنی دیر کیوں لگاتی ری... بہت جی لگتا ہے تیرا وہاں... اب اکیلی کبھی دیوڑھی پر مت جاتا... اب کی بار خواجہ بی پر اس کی نظر پڑی تو وہ چونک پڑی۔ ایک منٹ کے ہزاروں حصے میں جیسے وہ پوری بات سمجھ گئی۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے۔ بڑی دیر کے بعد اس نے زبردستی اپنے کو سمیٹ کر اٹھایا۔ خواجہ بی اندر کوٹھری میں لیٹی سسکیاں لے رہی تھی... نوراً کا بچہ رو رہا تھا اور نوراً سر جھکائے دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر کوئی فلم دیکھ رہی تھی بچے کے رونے کی آواز ہزاروں رونے والوں کی آوازوں میں بدل گئی۔ دھانیں دھا ئیں بندوقیں چل رہی تھیں۔ ہم پھٹ رہے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے دھول اڑ رہی تھی اور لوگ خون میں نہائے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔ اچانک احمد بی کے پاؤں کے پاس سلیم کا سر آکر گرا اور وہ چیخ مار کے اچھل پڑی۔

...آنگن میں سلیم تھا نہ اس کی درانتی

...سلیم...سلیم... تیرے پاؤں پڑتیوں...نکو جارے

وہ چلاتی ہوئی گلی میں بھاگنے لگی۔

کیوں گلا پھاڑ کو چلا ری ہے گے۔ ریڈی کے دیوڑھی پر رنڈی کا ناچ ہو رہا ہے۔

.....دیکھنے گیا ہوگا

ابو خاں نے کہا۔ وہ اپنے سیٹھ کے ہاں بھینسوں کا چارہ سر پر لئے جارہا تھا۔ پورے گاؤں کے لوگ رنڈی کا ناچ دیکھنے وینکٹی کے گھر گئے ہیں۔ مگر ریڈی اسے بھی چھٹی نہیں دیتا۔ وہ ریڈی کے گھر لگی ہوئی روشنیوں کو غور سے دیکھتا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔



رات گناہ کی طرح پورے گاؤں پر چھا رہی تھی۔

بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دھیرے دھیرے ”چیکٹ پلی“ ٹوب رہا تھا۔ مگر پورے گاؤں کا اندھیرا مل کر بھی وینکٹ ریڈی کے جگمگاتے گھر کو نہ چھپا سکا۔ آج تو اس کا گھر رنگین قمقموں کی روشنی میں جگمگا رہا ہے۔

مستان کو دور سے یوں لگ رہا تھا جیسے سیاہ اندھیرے میں روشنی سے بنا ہوا وینکٹ ریڈی کا گھر پورے گاؤں سے اوپر اٹھ گیا ہے۔ بولے بولے اونچا ہوتا جا رہا ہے اس کے پورے گھر کی منڈیریں ، دروازے کھڑکیاں ، سب قمقموں کی سنہری لکیر سے چمک رہے تھے۔ جیسے اللہ میاں نے اس کے گھر کا نقشہ سونے کی لکیر سے بنایا ہو۔ آج اس کے دروازے پر شامیانہ

لگا تھا۔ اس کے نیچے سرخ دری پر نوبت اور شہنائی بجانے والے شہر سے آکر بیٹھے تھے۔ اور لاوڈ اسپیکر کی تیز آواز تو مستان کو اتنی دور تک سنائی دے رہی تھی۔

اود نیا کے رکھوالے، سن در دبھرے میرے نالے

اس وقت مستان گاؤں سے بہت دور کھیتوں کے اوپر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا۔... وینکٹ ریڈی نے اسے حکم دیا تھا کہ سرتاج کی کار سڑک پر آئی دکھائی دے تو اسے وہیں روک دے، اور کھیتوں والی دیوڑھی میں اُتار دے۔

اس اندھیرے میں میرا گھر کہاں ہوگا۔

مستان نے غور سے دیکھا تو اسے ہر طرف دُھواں ہی دُھواں نظر آیا۔ جیسے سارے گھر دھیرے دھیرے سلگ رہے ہوں، اور پورے گاؤں میں آگ لگی ہو۔ ویسے بھی برسین ہو گئیں

مستان کے گھر میں دیا نہیں جاتا تھا۔ کبھی اتنا تیل ہی نہ جڑتا۔ مگر آج تو سارے گاؤں میں اندھیرا نظر آرہا تھا۔ جسے ہر گھر کی روشنی وینکٹ ریڈی نے چھین کر اپنے گھر میں بھر لی ہو۔ آج اس کے آنگن میں حیدرآباد کے باورچی بریانی پکا رہے تھے۔ پوریاں تل رہے تھے۔ کیونکہ وینکٹ ریڈی کے چھوٹے بیٹے سری نواس کا منڈن تھا۔

اندر والے رنگین شامیانے کے نیچے تخت پر مخمل کی سنہری مسند بچھی تھی۔ اس پر گاؤں تکیے رکھے تھے۔ مسند سے باہر سڑک تک سرخ کپڑے کا فرش تھا کہ آنے والے اس پر چل کر آئیں۔ اس فرش کے اور رنگ برنگی روشنیوں اور پھولوں سے چادرسی تان دی تھی تا کہ آنے والے مہمان اسی راہ سے چل کر اندر آئیں۔ یہ سچ دھج ریڈی نے حیدرآباد کے ایک جاگیردار کی شادی میں دیکھی تھی، اور یہ خواہش دل میں دبائے بیٹا تھا کہ ایک دن اس کے دروازے پر بھی اسی ہی روشنی ہوگی۔ جب لائٹ لگانے والوں نے سونچ آن کر کے سارے گھر کو آجال دیا، تو مستان خوشی کے مارے پاگل ہو گیا۔... وہ بار بار روشنیوں کی چادر تلے سے ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ جیسے یہ اہتمام اس کے لئے کیا گیا ہو۔ ویسے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ چاہے اس کے نیچے سے ہزار مہمان گزریں۔ مگر اصل میں تو یہ روشنیوں اور پھولوں کا شامیانہ رنگاریڈی کے لئے ڈالا گیا ہے۔ تا کہ وہ اس کے نیچے سے یوں گزرے جیسے انگاروں پر چلا رہا ہو اس کی ساری اکڑ جل کر راکھ ہو جائے۔

سارے گاؤں کے بچے بڑے عورتیں وینکٹ ریڈی کے گھر کے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ روشنیوں کا تماشا دیکھنے... اور مستان بیل ہانکنے کی چھڑی سے سب کو دُور ہٹاتے ہٹاتے بانپ گیا تھا۔

آج گھر میں کتنا کام تھا۔ ایک مہینے سے اس تقریب کی تیاریاں ہو رہی تھیں مستان کے بیوی بچے دن رات کام کر رہے تھے... وینکٹ ریڈی جانے کتنی بار حیدرآباد گیا، باورچیوں کو بلانے، لائٹ والوں کا بندوبست کرنے۔ بھائیوں اور دوستوں کو دعوت دینے۔ سرتاج کو مجرے کی دعوت دینے... وہ بار بار اپنی ماں اور رتنا سے کہتا تھا۔

اب کی بار سالے رنگا ریڈی کو بلا کر نیچا دکھاؤں گا۔ بیٹی کی شادی میں اشرفیاں لُٹا کر ہم پر رعب ڈال رہا تھا ”  
‘ ‘ ‘... چھچھورا... کو مٹی

اور تمہارے کو بولا تھا پاؤں کے نیچے اشرفی ہے اٹھالو“... مستان ہر بار اسے یہ ذلت آمیز بات یا دلاتا تھا۔

چپ بیٹھ گدھے...“ وینکٹ ریڈی نے مستان کو ڈانٹ دیا... اور گدھاچپ بیٹھ گیا کسی کونے میں۔ اور یاد کرتا رہا کہ ”  
رنگا ریڈی کے ہاں شادی میں وہ بھی... وینکٹ ریڈی کی بکھی کے پیچھے کھڑا ہو کر نلگندہ کے کسی گاؤں میں گیا تھا۔ تا کہ بگھی سے اُترتے وقت وینکٹ ریڈی کی کلف لگی دھوتی کا پلہ ٹھیک کر سکے۔ اسے پیاس لگے تو ساتھ لائی ہوئی صراحی میں سے چاندی کے گلاس میں نکال کر پانی پیش کر سکے۔ اور وہ جانے کو اٹھے تو لوگوں کو ہٹا کر بگھی تک اس کے لئے راستہ بنا سکے۔ وہ پچیس برس سے دن رات وینکٹ ریڈی کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ یہ ریڈی کی عنایت تھی کہ ایک کھیت مزدور کو رہن رکھ کر اس نے کھیتوں میں ہل چلانے یا پتھر پھوڑنے کا کام دینے کی بجائے صرف خاص کاموں کے لئے رکھا تھا۔ اور پھر کھانا الگ۔

یہ بات پوشما دن میں کئی بار مستان کو سناتی تھی کہ رہن والے مزدور کو کوئی کھانا نہیں دیتا۔ اس لئے مستان یہاں کی روٹیاں توڑتا ہے۔ مگر وہ جانے کس کھال کا بنا ہوا تھا کہ اس پر کسی کی گالی گلوچ کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ جیسے وہ بہرہ ہو... یوں صورت سے بھی وہ نرا ہے وقوف لگتا تھا جیسے کئی نسلوں پہلے سے اس کی عقل خوبصورتی، صحت، سب کس کس کر نچوڑ لی گئی ہو... اب وہ ریڈی کے ہاں کی بچی ہوئی بریانی نہیں کھا سکتا کہ چکنائی اسے بضم نہ ہوتی تھی۔ مٹھائی کھالے تو چکر آجاتا چائے پینے سے ابکائی آتی... اس لئے وہ ریڈی کے ہاں کا بچا ہوا کھانا پھٹے رومال کے پلو میں باندھ کر گھر لے جاتا تھا۔ بچوں کے لئے۔ اور خود اُبلی دال، لال جوار کی روٹی یا مرچی کی چٹنی کھاتا تھا... چھوٹا سا سری نواس اکثر اس کا مذاق اڑاتا۔

”مستان ایک دن بریانی کھا کر دیکھ، بڑے مزے کی ہوتی ہے۔“

بو سرکار... مگر میرے کو بضم نہیں ہوتی ہے قنے ہو جاتی ہے... وہ ہم لوگ کبھی بچپن سے دال بگھار کو نہیں ”کھائے نا۔“ بچے اس کی باتوں پر ہنسنے لگتے تھے۔

گھٹا ہوا سر جس پر خوب بڑی پگڑی بندھی رہتی تھی۔ وینکٹ ریڈی کا پھٹا ہوا بنیان اور

پھٹی ہوئی لنگی پہنے، وہ سارا دن بھاگ دوڑ کرتا تھا۔ وینکٹ ریڈی کے ساتھ ہمیشہ وہ بھی حیدرآباد جاتا تھا۔ اس کے شہر والے دوست اور بھائی آتے تو ان کے لئے شراب اور کھانا لاتا۔ شہر کی طوائفوں کو حیدرآباد سے لانا۔ اور ان عورتوں کو رات میں ٹھہرنے کے لئے دیوڑھی میں انتظام کرنا۔ وینکٹ ریڈی گھر والوں سے کہتا تھا کہ آج کھیتوں حساب کتاب کرنا ہے۔ اور مستان بھی سب سے یہی کہتا کہ آج ریڈی بہت مصروف ہے۔

جس دن وینکٹ ریڈی، رنگاریڈی کے ہاں شادی میں گیا تھا تو مستان بھی ساتھ تھا۔

مستان کو یہ بھی معلوم تھا کہ وینکٹ ریڈی کی رنگاریڈی سے پرانی دشمنی ہے۔

رنگاریڈی خاندانی رئیس تھا۔ اس کے دادا محبوب علی خاں کے زمانے میں منصب جاگیر سے نوازے گئے تھے۔ اور جس وقت رنگاریڈی کے دادا گھوڑے پر چڑھ کر گاؤں کی سیر کو نکلتے تھے تو وینکٹ ریڈی کا دادا گھوڑے کی لگا میں پکڑے پیچھے پیچھے، دوڑتا تھا۔ یہ بات دینکٹ ریڈی کو میں مانٹے کی طرح کھٹکتی تھی تو رنگاریڈی کے دل میں پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ پھر ایک دن وہ آیا کہ وینکٹ ریڈی کا دادا آگے آگے دوڑنے لگا۔ چھوٹی موٹی چیزیں رہن رکھ کر، بے ایمانیاں کر کے، کسانوں کی زمینوں پر قبضہ کر کے اور جاگیرداروں کو ادھار دے کر آج وہ چیکٹ پلی کا سب سے اہم آدمی بن گیا تھا۔ مگر بظاہر دوست ہوتے ہوئے آج بھی رنگاریڈی یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور جتا دیتا تھا کہ وینکٹ ریڈی کا دادا کون تھا۔ اس لئے رنگا ریڈی کے ہاں شادی میں گیا تو بڑی شان و شوکت سے۔ ایک ہزار کے تو صرف تحفے لے گیا ساتھ

پھیروں کے بعد جب چاندی کی اشرفیاں دولہا دلہن پر چاولوں اور پھولوں کے ساتھ نچھاور ہو رہی تھیں تو اس پاس کھڑے ہوئے لوگ چھینا جھپٹی کرنے لگے۔

وینکٹ ریڈی ایک طرف سرک کر کھڑا ہو گیا تو رنگا ریڈی نے ہنس کر کہا۔

”وہ آپ کے پاؤں کے پاس اشرفی پڑی ہے اٹھا لیجئے نا۔“

اس کی بات وینکٹ ریڈی کے دل میں تلوار کی انی بن کر اتر گئی۔ وہ چپ رہا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اسی وقت گھر واپس چلا گیا۔

اس کے بعد کئی راتوں وینکٹ ریڈی کو نیند نہیں آئی... انتقام کی آگ میں وہ کھولتا رہا، پھر اس نے سوچا ہٹاؤ، اپنی ماں کی یہ خواہش پوری کر ہی ڈالوں کہ... سری نواس کا منٹن دھوم دھام سے ہو۔ اس بہانے اتنی دھوم دھام ہو کہ رنگاریڈی کی آنکھیں پھٹ جائیں اس کے ٹھاٹھ ہٹ دیکھ کر۔ رنگا ریڈی شرم سے گردن جھکا لے اور زمین پر گری ہوئی اشرفی ڈھونڈتا پھرے۔

حالانکہ یہ دن اچھے نہ تھے۔ ہر طرف افرا تفری پھیلی ہوئی تھی۔ ریاست کو انڈین یونین میں شامل کر دینے کی افواہیں گرم تھیں۔ ہر شخص پریشان کہ جانے اب کیا ہوگا ! ادھر تلنگانہ کے چھاپہ مار دستوں نے گاؤں میں دہشت پھیلا دی تھی۔ خاص طور سے رنگاریڈی کا تو جینا حرام تھا کہ اس کے ضلع کے آس پاس پارٹی والے دو چار گاؤں پر قبضہ کر بیٹھے تھے۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت نے گاؤں کے تحصیل داروں، پٹیل پٹواریوں پر بڑی سختی کر رکھی تھی۔ ہر ہر بات کی خبر رسائی کی جارہی تھی۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور راجاؤں کے محلوں کی چھان بین کی گئی اور پھر ایک محکمہ ”انسداد بے رحمی بر انسان“ قائم کیا گیا ، جو اچانک چھاپہ مار کے دیوڑھیوں اور بنگلوں میں رہنے والی لونڈیوں ، نوکروں سے باز پرس کرتا تھا۔

ادھر گاؤں میں آنے دن نئے نئے قانون لاگو ہو رہے تھے۔ تمام جاگیرداروں اور سابوکاروں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ ہر چھ مہینے اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب سرکار میں پیش کریں۔ پھر لگائی بجھائی کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ یوں بھی گاؤں میں تو ہر بات دال کے بگھار کا چھنا کا بن کر گونجتی ہے۔ خاص طور سے وینکٹ ریڈی تو تمام مسلمان کسانوں اور دلاور علی خاں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ ہر سال اس کے اونچے ہونے والے گھر پر سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ پورے چیکٹ پلی میں صرف وینکٹ ریڈی کا ہی ایک گھر تھا جو آگے پیچھے اوپر نیچے پھیلتا ہی جارہا تھا۔ اس کے کھیتوں کا سلسلہ بھی پہاڑوں سے جالگا تھا۔

آجکل چیکٹ پلی میں تین معزز ہستیاں تھیں۔ ایک تو صابر میاں ، چبے شاہ کی درگاہ کے سجادہ نشین ، جن کی زریں کلاہ ہمیشہ چمکتی رہتی تھی۔ کیونکہ زمانہ کیسا ہی ہو ، کسی کا راج آئے۔ مگر لوگ اپنے دین ایمان کو تو نہیں بھول سکتے۔ مریدوں مرشدوں کے بیچ میں کون دخل دے سکتا ہے۔ اور مصیبت کے دنوں میں تو سات گاؤں کے لوگ چل چل کر آتے تھے۔ صابر میاں کی سیاہ عبا تھام کر اپنی فریاد سناتے۔ ہر سال جب مدار کے مہینے میں درگاہ کا عرس ہوتا تھا تو صابر میاں اور ان کے دونوں لڑکے صبح شام ” بنڈی“ خالی کر کے گٹھڑیوں میں روپے باندھ کر گھر لے جاتے تھے۔ یہ سب حضرت چبے شاہ کی برکت تھی جس کے فیض سے صابر میاں اور ان کی اولاد دسر خرو ہوئی۔ صابر میاں کا فیض جاری تھا۔ ہر سال لوگ سنتے کہ کسی گاؤں سے آئی ہوئی شیطان کے سائے والی لڑکی کو اچھا کرنے کے لئے صابر میاں نے اس سے نکاح کر لیا۔۔۔ کیا کرتے۔۔۔ نامحرم کو اپنے ساتھ رکھ نہیں سکتے تھے۔ اور اس کے سر سے شیطان کا سایہ بھگانا ضروری ہوتا۔ حالانکہ اس کے لئے انھیں اپنی پہلی چاروں بیویوں میں سے کسی ایک نیک بی بی کو طلاق دینا پڑتی تھی کہ اس کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا۔

مگر اتنے اللہ والے پہنچے ہوئے بزرگ کی اولاد بڑی نالائق ، نا خلف نکلی۔ صابر میاں کے لڑکے اللہ جانیں نہ رسول۔۔۔ سارا دن گاؤں کے پولیس پٹیل کے ہاں سیندھی شراب پیتے، جو اکھیلنے اور درگاہ کی زیارت کے لئے آنے والی عورتوں کو گھیرتے تھے۔ گاؤں والے کچھ نہ کہتے کہ اتنے بڑے پیر کی اولاد ہیں۔ وقت آنے پر حضرت چبے شاہ کے کرم سے ضرور راہ راست پر آجائیں گی۔ انشاء اللہ۔

دوسرا آدمی وینکٹ ریڈی تھا ، جس کا دادا نواب دلاور علی خاں کے کھیتوں پر کام کرتا تھا۔ اس نے گاؤں والوں کی چھوٹی موٹی چیزیں رہن رکھنے کا دھندا شروع کیا اور پھر جاگیرداروں کے کھیتوں پر کھیت بضم کرتا گیا۔ آج پولیس پٹیل اور مالی پٹیل اس کے آگے پانی بھرتے تھے۔ وینکٹ کے باپ ڈرگیا نے اپنے دونوں بیٹوں وینکٹ ریڈی اور ملیشم کوشہر بھیج کر کالج میں بڑھایا۔

وینکٹ تو تین بار انٹر فیل ہو کر گاؤں آبیٹھا۔ مگر ملیشم نے بی، اے پاس کیا۔ اب اس کا گاؤں میں دل نہ لگتا تھا۔ اس لئے اس نے ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ کالج سے پڑھائی کے بہانے وہ خوب رنگ رلیاں مناتا تھا۔۔۔ درگیا نے بیٹوں کے آگے بہت سے بندھ باندھنا چاہے۔ آخر دوسرے گاؤں سے خوب پیسے والی لڑکیاں دونوں کے لئے ڈھونڈیں اور ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔۔۔ وینکٹ تو اب کھیتوں اور باغوں کو بڑھانے میں لگ گیا تھا۔ اس لئے وہ تو اس بدصورت گنوار لڑکی پر صبر کر بیٹھا کہ اسے پیسے کے زور پر ہر روز منہ کا مزہ بدلنے کو عورت مل جاتی تھی۔ مگر وکیل صاحب کو اپنی جاہل کالی کلوتی بیوی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ وہ مستقل حیدر آباد میں رہتا تھا۔ وکالت کے کاموں میں اُلجھا رہتا۔ بیوی یہاں ساس کے پاس بیٹھی کروشیا کے پھندوں میں اپنی قسمت کا جال بنتی رہتی تھی۔ جب کبھی دوسرے تیسرے مہینے ملیشم اپنے دوستوں کے ساتھ آم کھانے یا پکنک منانے آتا تھا تو اس کی بیوی راج کالکشی لیا ئیں چھپائیں دوستوں کی دعوت میں مصروف ہو جاتی۔ اس کا ہر حکم خوشی خوشی مانتی۔ اس کے باوجود جانے سے پہلے کسی بات کا بہانہ کر کے ملیشم اس کی کمر پر دو چار لاتیں جماد پتا تھا۔ بس اس درد کو تھامے وہ دو چار مہینے اور گزار دیتی۔

اُجاڑ صورت اُجاڑ کو کھ لئے بیٹھی ہے۔ ایک بچہ بھی نہیں ہوا... اسی لئے ملیشیم اسے گاؤں میں چھوڑ کر چلا جاتا ”  
 ہے“... اس کی ساس پوشما گاؤں کی عورتوں کو سناتی تھی۔

پھر وینکٹی کی وہ چبختی چلاتی بیوی جس نے وینکٹی کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ چوتھے بچے کی پیدائش پر  
 اچانک مر گئی... تین دن کا سری نواس راج لکشمی نے اپنی گود میں اٹھالیا۔ اور پھر وہ اپنے دیور کے بچوں کو پالنے میں  
 ...کھو گئی

بچارہ رات بھر کروٹیں بدلتا ہے“... پوشما کو وینکٹی کی جوانی پر ترس آتا تھا کہ جو رو کے بغیر مرد کی زندگی ”  
 خالی گھر کی طرح بھا نہیں بھا ئیں کرتی ہے۔ مگر وینکٹی کو اپنی اس زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

باپ کے چھوٹے سے رہن سنٹر کو وہ بڑھاتا گیا۔ ہر سال جب سوکھا پڑتا تو گاؤں والوں کے زیور اور برتن اس کے  
 پاس رہن کے لئے آجاتے اور دو چار ایکڑ زمین وہ اور خرید لیتا۔ تین چار کھیت مزدوروں کو رہن رکھ لیتا۔ جوار ، چاول، گنا  
 اجوائین ، ہر چیز کی فصل اس کے کھیت میں لہلہا کر آتی تھی۔ دادا کے زمانے کا کمر ٹوٹا ہوا گھر توڑ کر اس نے بالکل  
 جاگیرداروں کی دیوڑھی جیسا شاندار گھر بنایا۔ جب آم اور گنے کی فصل آتی تو ملیشیم کے دوست شہر سے پکنک مناتے۔ مستان  
 اور اس کی بیوی احمد بی کھیتوں والی دیوڑھی میں جا کر مرغ اور بریانی پکاتے تھے۔ اس کے دوست کھیتوں اور باغوں میں  
 گھوم گھوم کر پکے پکے پھل اور کچی کچی لڑکیاں تا کتے تھے۔ کبھی یہ لڑکیاں زور زبردستی سے لائی جاتیں۔ کبھی دس پانچ  
 روپے پر بات ہو جاتی تھی اور کبھی وینکٹی ان کے لئے حیدر آباد سے طوائفیں بلوا تا تھا۔ ان بی طوائفوں میں ایک بارسرتاج آئی  
 تو پھر وہ وینکٹی کے دل سے نہ جاسکی... وہ بھی کیا کرتا۔ بیوی کو مرے پانچ برس ہو گئے تھے۔ اس کی زمینیں دور دور تک  
 پھیل رہی تھیں۔ اور وہ ہر فصل پر ماں کے کمرے میں گڑھا کھود کر روپیہ گاڑ رہا تھا۔ مگر روپیہ زمین میں گاڑ دینے کے لئے  
 تو نہیں ہوتا۔ اور پھر سور و پے مبینہ سرتاج پر خرچ کرنا کونسا بڑا کام تھا۔ اور اس پاس کے جاگیرداروں ریڈیوں میں کنتی  
 شہرت ہوئی اس بات کی... لو اور سٹوڈرگیا کا بیٹا وینکٹی اتنے پیسے والا ہو گیا ہے کہ رنڈیاں رکھنے لگا۔ اس وقت بڑے آدمی  
 کی نشانی یہی تھی کہ دروازے پر ہاتھی جھو میں۔ آنگن میں رنڈی ناچے۔ مگر بہت جلد ایک دن اسے رتنّا نظر آئی۔ رتنّا کا باپ  
 بھی کسی گاؤں کا غریب کسان تھا۔ اس کے پاس کھیت تھے نہ بل بیل۔ سات بچوں میں جب رتنّا کا بھی اضافہ ہوا تو اس نے بارہ  
 سال کی رتنّا کو اپنی ماں کے ساتھ شہر میں نوکری کرنے بھیج دیا۔ رتنّا ایک کالج کے پروفیسر کے ہاں اوپر کام کرتی تھی۔ جب  
 وہ ذرا بڑی ہوئی تو ایک دن وینکٹ ریڈی پروفیسر صاحب کے ہاں کسی کام سے گیا اور رتنّا کو ان کی لڑکی سمجھ کر ہزار جان  
 سے عاشق ہو گیا۔ رتنّا تھی بی ایسی ہوش و حواس اڑا دینے والی۔ جو بی کی کلی جیسی نازک ، گوری گوری معصوم صورت اور  
 ہر نی جیسی آنکھیں ، پھٹے پرانے لہنگے چوبی میں وہ جگنو کی طرح چمک رہی تھی۔ دوسرے دن وہ پروفیسر صاحب کی  
 خدمت میں ایک عرضی لے کر پہنچا..... بس دو چار دن بعد ہی وہ ترین کے ڈبے میں سرخ کتان کی ساڑی میں لپٹی اپنی ننھی  
 سی دلہن کو لئے چیکٹ پلی کی طرف جانے لگا پوشما اس کی اتنی کم عمر خو بصورت کی دلہن کو دیکھ کر بہت چلائی کہ اس  
 نے کسی مالدار ریڈی گھرانے میں بات شرور کر رکھی تھی۔ کیونکہ وینکٹ ریڈی کی دونوں لڑکیاں بیابی جا چکی تھیں۔ سری  
 نواس بڑا ہو رہا تھا۔ اب تو کوئی بڑے گھر کی بیٹی آ کر اس راج سنگھاسن پر بیٹھ سکتی تھی۔ مگر بیرے کی کئی جیسی رتنّا کو  
 دیکھ کر سارا گاؤں دنگ رہ گیا... سب دوڑے دوڑے آئے۔ سلیم بھی ریڈی کی دلہن کو دیکھنے آگے بڑھا تو اسے پہلے دلہن کی  
 سیندور بھری مانگ دکھائی دی اور پھر اس نے اپنی بادام جیسی کا جل والی آنکھیں اٹھا کر سلیم کو دیکھا... سلیم منہ کھولے  
 ساکت ہو گیا... اتنی خوبصورت عورت اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی... سب چلے گئے... وہ بیٹھار ہا اور جھک جھک کر  
 اسے دیکھتا رہا... اتنے سفید ہاتھ جیسے گیہوں کے آنے سے بنائے گئے ہوں۔ اور ایسے خوبصورت پاؤں جو گوہر سے لپے  
 ہوئے آنگن میں بالکل نہیں رکھے جاسکتے۔ بس سلیم نے طے کر لیا کہ آج سے وہ ریڈی کے ہاں برتن خود دھوے گا۔ جھاڑو لگا  
 دے گا۔ رتنّا کو کوئی کام نہیں کرنے دے گا۔

تو ہٹ میں کمرہ میں جھاڑو لگادوں گی...“ وہ سلیم کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لیتی، مگر وہ ہرگز نہ دیتا۔“

تمہارے ہاتھ میلے ہو جا ئیں گے...“ وہ جلدی جلدی فرش صاف کرتے میں کہتا۔ مگر وینکٹی اندر آ جاتا۔“

یہ چھوکرے کو کمرے میں کیوں آنے دیتی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔“

جب رتنّا پر اتنی نظریں پرنے لگیں تو وینکٹی گھبرا گیا۔ لوگ کہتے رتنّا تو وینکٹی کی بیٹیوں سے بھی چھوٹی ہے۔ اور پچاس برس کا تھل پھل وینکٹی آئینہ میں بڑے غور سے اپنی صورت دیکھتا تھا تو بڑھاپے کی تھکن اور بڑھ جاتی تھی۔ پھر وہ رتنّا کو پسند کرنے والوں پر غصہ اتارنے لگا۔

رتنّا کے لئے اس گھر میں کوئی دلچسپی نہ تھی... وہ پیدا تو ہوئی تھی گاؤں کے ایک غریب گھرانے میں۔ مگر شہر کے ایک بڑے گھر میں رہ چکی تھی۔ وہ شہر میں رہنے کے طور طریقے جانتی تھی۔ میز کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ موٹر میں بیٹھ کر باہر جاتے ہیں۔ کمروں میں پکے فرش پر قالین بچھا کر اس پر صوفے رکھے جاتے ہیں۔ صاف ستھرے کچن میں گنیس کے چولہوں پر پکوان کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں گیلی لکڑیوں کے دھوئیں سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ اور جس وقت احمد بی چولہا لپینے کو بر بالٹی میں گھولتی تو بد بو کے مارے وہ اپنی ناک پر پلو رکھ لیتی تھی۔

وینکٹی کے ڈرائنگ روم میں دری پر ایک رنگین چادر بچھی تھی۔ اور دیواروں پر چیتا ہوا سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ لمبی بی کیلوں میں ستلی سے باندھ کر پرانے کبلنڈر اور لارڈ وینکٹیشور کی تصویر میں لٹک رہی تھیں۔ دروازے کے اوپر وینکٹ ریڈی کی جوانی کا بڑا سا فوٹو سنہری فریم میں لگا تھا۔ جس میں وہ اپنی بڑی بڑی مچھوں کی وجہ سے ڈا کو لگتا تھا۔ رتنّا کو اس فوٹو سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ وہ وینکٹی کو شہر کے طور طریقے سکھانے کی بڑی کوشش کرتی تھی۔ مگر وینکٹی اپنی برتری جتانے کے لئے اسے ہر وقت بے وقوف ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ حالانکہ وہ بہت کچھ جانتی تھی... چلتی پھرتی تصویروں کا سینما کیسا ہوتا ہے۔ ریل صرف پٹریوں پر چلتی ہے اور موٹر میں

جب تک تیل نہ ڈالا جائے وہ نہیں چلتی۔ مگر وینکٹی بغیر تیل کی موٹر کو گھسے جاتا۔

یہ تو ہر وقت سلیم کے ساتھ کیا کھی کھی کئے جاتی ہے۔ اچھے اچھے کپڑے پہن کر مسہری پرلیٹ جایا کر گھر میں کام کرنے والے بہت ہیں۔

وہ رتنّا کو بہت چاہتا تھا۔ اس لئے وہ کبھی گاؤں میں اپنے گھر سرتاج کو نہیں لایا۔ اسے ماں بیوی کی صورت نہیں دکھائی۔ وہ شہر سے بندھی میں بیٹھ کر مستان کے ساتھ گاؤں آتی تھی اور کھیتوں والے گھر میں اُترتی۔ مستان رتنّا سے کہتا تھا۔

”شہر کے تحصیل دار صاب آے ہیں۔ حساب کتاب کرنے۔“

اور دونوں ساس بہو اس کے لئے اصلی گھی کی پوریاں، مرغ اور شراب کی بوتلیں دیوڑھی میں بھجواتیں... ساری رات وینکٹی تحصیلدار صاب کا حساب کتاب چکا کر صبح تھکا ہارا گھر آتا تھا تو شام تک اسے جگانے کی رتنّا کو اجازت نہیں تھی۔

اتنا بڑا کاروبار ہے۔ اگر تحصیل دار صاب مہربان نہ ہوں تو سب دھندا چوپٹ ہو جائے۔

وینکٹی کی ماں پوشما سردیوں میں چٹائی بچھا کر آنگن میں بیٹھی تو آس پاس کی اور عورتیں بھی اپنی سلانی لے کر آجاتیں۔

سنا ہے حیدر آباد میں تو سچ مچ چلنے والی تصویروں کا تماشہ دکھایا جاتا ہے۔ اور اعلیٰ حضرت پون پون بولنے والی موٹر میں بیٹھ کر نماز پڑھنے مسجد کو جاتے ہیں... ابھی تک حیدر آباد گاؤں کی عورتوں کے لئے ایک خواب تھا کہ اپنا دیس چھوڑ کر شہر جانے والے لونڈوں کو گاؤں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہاں جو گیا بُری باتیں سیکھ کر آیا۔ مگر پوشما کو یہ فخر حاصل تھا کہ اس کے بیٹے شہر میں بڑی پڑھائی پڑھ چکے ہیں اور ایک بیٹا ملیشمن تو شہر کا مشہور وکیل تھا... کتنی بار ملیشمن نے کہا

ماں اب کی بار تو بھی حیدر آباد چل۔ کسی ڈاکٹر کو تجھے دکھاؤں گا۔“

نکورے باوا... میں شہر نہیں جاتی...“ وہ شرما کر سر پر پلو کھینچ لیتی۔“

ڈاکٹروں کی دوا میں گرم آگ ہوتی ہیں۔ دیکھا نہیں صابر میاں کی بیوی دوا پیتے ہی مرگئی تھی۔

شہر تو دُور رہا پوشمّا تو کبھی اپنے ضلع تک بھی نہیں گئی تھی۔ نہ اس نے اپنا پورا گاؤں دیکھا تھا... ریڈی قوم میں عورتیں مسلمان عورتوں کی طرح پردے میں رہتی ہیں۔ انتہائی ضرورت کے سوا گھر سے نہیں نکلتیں۔ ساس، سسر اور جیٹھ کے سامنے سر ڈھانپ کر آتیں۔ گھر میں آنے والے دھیڑ چمار اور غریب مزدوروں سے بھی انہیں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پاس پڑوس یا رشتے داروں میں نکلنا ہوتا تو ساس یا جٹھانی کے ساتھ جاتی تھیں۔ گھر کے مرد جو لاتے کھا لیتیں۔ جو پہناتے پہن لیتیں۔ جو سمجھاتے مان لیتیں۔ عورت ذات تو ریڈی قوم پر عذاب بن کے نازل ہوتی ہے۔ اسی لئے تو تلگو میں مثل مشہور ہے کہ: تین لڑکیوں کے باپ کی چوری بھگوان بھی معاف کر دیتا ہے۔ ریڈی کی بیٹی باپ کی پوری کمائی لے کر گھر سے وداع ہوتی ہے۔ ملیشّم کی بیوی تو اپنا کچھ جہیز میکے چھوڑ آئی تھی۔ اب ہر صل پر ملیشّم کا خسر بقایا رقم ادا کر نے آتا تھا۔

رتنّا نے بھی جلدی ہی ساس کے سارے گن سیکھ لئے تھے۔ غریب لوگوں کو خیر خیرات دینا۔ گُنبیوں، دھیڑوں کے وقت بے وقت کام آنا۔ صبح گوالا سات بھینسوں کا دودھ دہتا تھا۔ پھر رتنّا صبح سویرے پوجا کے بعد گاؤں کی عورتوں کو دودھ اور چھانچ بانٹتی تھی۔ سلیم کے لئے جھوٹے چاول الگ اٹھا کر رکھ دیتی تھی۔ دیوالی کے دن مرغ اور بکرے کا گوشت پکاتا تھا... وینکٹی کے بہت سے مسلمان دوست بیٹھک میں آکر بیٹھتے تھے تو رتنّا نیز مرچوں والے ایسے چٹ پٹے کباب بناتی تھی کہ چاروں گھروں میں خوشبو اڑتی، اور اس کا دوست رنگا ریڈی، وینکٹی کے کاندھے پر ہاتھ مار کے کہتا تھا:

”تو بڑا نصیبیوں والا ہے رے۔ اتنی خوبصورت بیوی ملی اور ایسی سگھڑ۔“

”نیری بیوی کے ہاتھ سے بنے کباب کھانے کے لئے میں سال بھر ترستا ہوں۔“

چل چل... زیادہ باتیں نکوکر...“ شرابی کبابی دوستوں کے منہ سے اسے اپنی بیوی کا ذکر اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ سچ ”مچ کسی دیوی کی طرح پوتر لگتی تھی۔ صبح سویرے نہا دھو کر پیروں کو بلدی سے رنگتی... ناریل کے تیل میں بال بھگو کر خوب کس کے جوڑا باندھتی تھی۔ پھر گیندے کے پھولوں کی بینی لگاتی۔ ماتھے پر سرخ بٹو، سنہرے بارڈروالی ہری ساڑی، سرخ کھن کی چولی... وہ پوجا کی تھالی لئے، وینکٹی کے کمرے میں جاتی تھی تو سلیم کو یوں لگتا جیسے دیول کی دیوی اپنے استھان سے اتر آئی ہو۔

چیکٹ پلی کی تیسری اہم شخصیت نواب دلاور علی خاں کی تھی۔ جن کا سلسلہ نسب پائینگاہ والوں سے جا ملتا تھا۔ ان کے دادا چیکٹ پلی میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئے تھے تو کئی گھنٹے تک اپنی زمین پر ہی چلتے۔ ویسے تو ایک اور نواب صاحب کی بھی جائیداد چیکٹ پلی میں تھی۔ جنہیں سب چنو نواب کہتے تھے۔ مگر قرض اور رشتے داروں کے جھگڑوں نے انہیں اب کھوکھلا کر دیا تھا۔ لیکن جنگل میں جب ایک چھوڑ تین تین شیر ہوں تو... بادشاہت کے مسئلے پر لڑائی جھگڑے ضروری تھے۔ اس لئے چیکٹ پلی میں بھی آئے دن سر پھٹول ہوئی تھی۔ کبھی کھیتوں کے پانی پر جھگڑا ہوتا تو کبھی کھیت مزدوروں پر... اقتدار کی ہوس، حکومت کا نشہ اور برتری کا احساس سات پشتوں سے نواب دلاور علی خاں اور چینو نواب کو چڑھا ہوا تھا۔ وینکٹ ریڈی جیسے نو بڑھیے جانے کتنی بار آئے اور گئے۔ دلاور علی خاں اور چھٹ بھینوں کو منہ ہی نہ لگاتے تھے۔ اسی لئے دلاور علی خاں کے ہر حکم کی نافرمانی کرنا وینکٹ ریڈی پر فرض تھا۔ ادھر چنو نواب الگ اپنی بڑائی جتانے جاتے تھے۔

چنو نواب کی نانی، حضور کے کسی جد امجد کی منظور نظر تھیں۔ اس لئے انہیں چیکٹ پلی کی جائیداد ایک شاہی فرمان کے ذریعہ عطا کی گئی تھی۔ اور یہ شاہی فرمان سنہرے فریم میں جڑا چنو نواب کے دیوان خانے میں لگا ہوا تھا۔ اس فرمان مبارک کو حیدرآباد کی دیوڑھی سے گاؤں کے دیوان خانے میں لاکر لگایا گیا، یہ ایک خاص بات تھی جو عام کوڑھ مغز لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ وہ نہ تو کسی مہ و ش رُخ روشن کی بدولت عیش کر رہے ہیں اور نہ یہ بات جانتے ہیں کہ گاؤں والے کس بات کو مانتے ہیں اور کس بات کی پروا کرتے۔ اعلیٰ حضرت کا فرمان مبارک ایک ایسا پر عظمت دل ہلا دینے والا ثبوت تھا کہ تمام گاؤں کے بڑے بوڑھے باتفاق آراء چنو نواب کو گاؤں کا سب سے اہم آدمی مان چکے تھے۔ کیونکہ گاؤں میں صرف سرکار کا حکم نہیں چلتا، بلکہ گاؤں والوں کے اپنے بھی قانون ہیں۔ جنہیں توڑنے کی ہمت کسی میں نہیں ہے۔ کوئی سرکاری قانون توڑے تو اکیلا جیل چلا جائے گا، مگر گاؤں کا قانون توڑنے والے کی آنے والی سات نسلیں اس جرم کی سزا بھگتی ہیں۔ لیکن گاؤں والوں کے کچھ اصول ہیں تو ان پر حکومت کرنے والوں کے بھی کچھ اصول ہیں۔

دلاور علی خاں اور چنو نواب میں پکی دشمنی سہی۔ مگر جب کوئی کسان سرکشی کرے تو جھٹ وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے گاؤں کا سرکشی کھیت مزدور یا سرکشی مویشی دوسرے گاؤں میں پناہ لینے آجائیں تو اسے پکڑ کر مالک کے حوالے کرنا ان کا اصول تھا۔ کوئی کھیت مزدور رہن کی مدت پوری کئے بغیر بھاگ جائے تو اسے سزا دینے پر وہ سب ایک ہو جاتے تھے۔ گاؤں کے کس حصے تک کس کسان کے کھیت کون رہن رکھے گا، کون خریدے گا، کون قرض دے گا اور کون نہ دے گا۔ یہ سب کسی پکے کاغذ پر لکھے بغیر ایسے اصول تھے، جن پر ہرگاؤں کے جاگیر دار اور ساہو کار عمل کرتے آئے تھے اور آئندہ بھی کرنا چاہتے تھے۔

دلاور علی خاں رہتے تو تھے شہر میں اور عیش کرتے تھے گاؤں کی جائیداد پر۔ اور اس جائیداد کو وینکٹ ریڈی دیمک کی طرح کب چاٹ چکا تھا۔ جب کبھی وہ منشی صاب سے بات کرتے تو وہ سنانا شروع کر دیتے تھے کہ فلاں بیگم سے شادی کے وقت وہ کھیت رہن رکھ دیئے تھے۔ اتنی جائیداد بڑی بیگم کے مقدمے بازی میں نکل گئی۔ فلاں طوائف کے ہاں جانے کے زمانے میں ختم ہو چکی ہے۔ نواب صاحب اب ساتھیوں سال میں قدم رکھ چکے تھے۔ مگر اسی برس کے لپوس بوڑھے دکھائی دیتے تھے۔ دانت بکرے اور مرغ کے گوشت نے ہلا ڈالے تھے۔ کمر چھیل چھیلی عورتوں نے جھکا دی تھی۔ دل دیوڑھی کی بیگموں اور داشتاؤں نے جلا پھینکا تھا۔ آنکھوں کی روشنی گیارہ صاحبزادیوں اور چھ صاحبزادوں نے بجھادی تھی۔ جب کبھی نواب صاحب ترنگ میں آکر کوئی رنگین ہی غزل لکھتے تھے تو منشی صاب شروع ہو جاتے۔

”صاحبزادے نجابت علی خاں پر قتل کے الزام والے مقدمے کی آج سنوائی ہے۔“

آج ان کا آپریشن صاحبزادے شرارت علی خاں نشے میں دوسری منزل کی سیڑھیوں سے جو گرے تھے تو ہونے والا ہے۔

”صاحبزادہ نفاست علی خاں پرسوں ریس میں اپنا مکان بار بیٹھے ہیں۔“

”صاحبزادہ قیامت علی خاں نے پھر بمبئی کی اس فلم ایکٹرس کو بلوایا ہے۔“

”اور صاحبزادی نازک اندام نے اپنے دوسرے شوہر پر بھی مقدمہ دائر کر دیا ہے۔“

‘ ‘ ‘ اور... اور ”



بس کر و منشی صاب... نواب دلاور علی خاں کی ڈانٹ دیوڑھی میں اتنی زور سے گونجتی تھی کہ ٹوٹی لگروں میں ”  
پناہ لینے والے کبوتر اڑ جاتے۔

یہ گاؤں میں سرتاج کا کیا قصہ چل رہا ہے؟“... وہ اپنی آواز دبا کر چاندی کے سگریٹ کیس کو اٹھا لیتے۔“

منشی صاب نے جواب دینے سے پہلے جلدی سے ایک چرس والا سگریٹ نکال کر سرکار کے منہ میں دبایا اور ماچس  
جلانے لگے۔ کیونکہ ہاتھوں کے ریشہ کی وجہ سے سرکار خود سگریٹ نہیں جلا پاتے تھے۔ ایک بار ایسی کوشش میں سگریٹ  
کی بجائے ان کی نوکیلی مونچھ جل گئی تھی۔ بس اس دن کے بعد سگریٹ سلگانے کا کام یا تو کوئی نوکر انجام دیتا یا ڈیوٹی پر  
آئی ہوئی کوئی قاتل حسینہ... مگر جب کوئی پری چہرہ سامنے ہو تو سرکار کو سگریٹ کے ہوش کہاں رہتے تھے! مگر رہتے  
تھے کہ وہ رس نچوڑے ہوئے آم کی گھٹلی بن کر رہ گئے تھے۔ بھر سرتاج جیسی طوائف کا ذکر بھی انہیں اچھا لگتا تھا۔ منشی  
صاب بھی جانتے تھے کہ سرکار کیا سننا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ خوب گہی شکر میں اپنی زبان ڈبو کر شروع ہو جاتے۔

سرکار آج تو گاؤں اور شہر کا ہر نو جوان بس سرتاج پر لٹو ہے۔ اپنے گاؤں کا وینکٹی تو ”

”اپنی پوری دولت اس پر نچھاور کر کے پھو کٹیا ہو گیا ہے۔

با ہا ہا...“ سرکار کو وینکٹی کے پھو کٹیا ہو جانے کا دلی ارمان تھا۔ اس لئے وہ جی بھر کے ہنسنا چاہتے تھے۔ مگر ”  
سینے کا درد اور کھانسی کے پھندے ہنسنے بھی دیں۔

ادھر سنا ہے وہ نلگنڈہ والا رنگا ریڈی بھی اسے دو سو روپے مہینہ دیتا ہے۔ مہینے میں صرف ایک بار جاتی ہے ”  
”وہ۔“

”دوسو...؟ اچھا ہم ملکہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

ملکہ حضور کے پاس کئی برس تک رہ چکی تھی۔ بلکہ وہ تو یہ بات بھی بڑی ادا کے ساتھ کہتی تھی کہ سرتاج کے (   
(مزاج تو بالکل جاگیرداروں جیسے شاہانہ ہیں

ایک بار ملکہ کی بے وفائی پر ناراض ہو کر سرکار نے جو منہ پھیرا تو بس وہ ان کے دل سے اتر ہی گئی۔ مگر سنا  
...ہے کہ سرتاج تو اپنی ماں سے بھی زیادہ قیامت خیز ہے اور پھر

برس سول یا ک ستر کاسن..... خوبصورت طوائف کے تصور ہی سے ان کے دل میں پھول کھلنے لگے۔

”ہم سوچ رہے تھے کہ صاحبزادے شرافت علی خاں کے صاحبزادے کی سالگرہ پر سرتاج کو مجرا کرائیں۔

واہ واہ کیا خوب بات کہی ہے حضور نے...“ منشی صاحب نہال ہو گئے کہ ایسی تقریبوں میں بے حساب روپیہ خرچ ”  
کرنے کا بہت اچھا وقت آتا ہے۔

”مگر سرکار ملکہ نے سرتاج کا بھاؤ بہت اونچا کر رکھا ہے۔“

”مگر میں آپ سے اس کا بھاؤ نہیں پوچھ رہا ہوں۔ آپ سالگرہ کا انتظام کرو۔“

منشی صاحب نے دانت نکو سے... منشی صاحب شطرنج کا گھوڑا تھے ہمیشہ آڑی چال چلتے۔ دیکھنے میں بالکل  
احق سے لگتے۔ دبلے پتلے خشخشی داڑھی، میلی سی ترکی ٹوپی کا پھندا ماتھے پر لہراتا رہتا تھا۔ سفید شیروانی، چوڑی دار  
پاجامہ، پتلی ٹانگوں پر منڈھا ہوا، ایک ہاتھ میں چھڑی، ایک ہاتھ میں ایک پرانا ساہستہ، جس میں دلاور علی خاں کی سات  
نسلوں کی عزت اور قسمت بندھی ہوئی تھی۔ اس بستہ میں اس خاندان کے تمام راز لیٹے ہوئے تھے اور وہ منشی صاب کی بڑھی  
میں دبا رہتا تھا۔ منشی صاب حضور سے اپنی بات منوانا جانتے تھے۔

دوسرے دن جھٹکے میں بیٹھ کر منشی صاب محبوب کی مہندی گئے اور پچاس روپے میں سرتاج کے مجرے کی بات پکی کر آئے۔ جھٹکے سے اتر کے منشی صاب حضور کی خلوت میں پہنچے ، جہاں سر کار کسی مصرعہ تر کی تلاش میں غوطہ زن تھے۔ منشی صاب نے سرکار کو یوں گم ہم دیکھا تو اُلٹے پیروں لوٹ جانا چاہا۔ مگر سر کار منشی صاب کا سیاہ فام منحوس چہرہ دیکھنے کو بے تاب تھے کہ ان آنکھوں نے چند گھنٹے پہلے سرتاج کی صورت دیکھی تھی۔

سرکار وہ اجاڑ صورت ملکہ تو سرتاج کے مجرے کے لئے تیار نہیں تھی۔ بولتی کتے وینکٹ ریڈی خفا ہوگا۔۔۔“ پھر ” جب میں سرکار کے عتاب سے ڈرایا تو پانچ سو روپے پر راضی ہوئی۔

ہونہ۔۔۔ اس الو کے پٹھے سے ڈرتی ہے۔ خیر ، ہم اس کا مزاج درست کر دیں گے۔ تم نے ملکہ کو بتایا نہیں کہ چیکنٹ ” پلی ہماری جاگیر ہے۔ ہم اس سالے ریڈی کو کان پکڑ کے نکال سکتے ہیں ‘۔۔۔ مگر یہ بات حضور نے بہت آہستہ کہی۔ کیونکہ سال بھر پہلے ہی منشی صاحب نے بتایا کہ وینکٹ ریڈی لوگوں سے کہتا ہے۔ ایک سال بعد وہ چیکنٹ پلی سے دلاور علی خاں کا نام و نشان مٹا دے گا۔۔۔ سالو کا پٹھا۔۔۔ بے ایمان۔۔۔ جاگیر داروں کی نقل میں طوائفین رکھے گا۔ دھیر کی اولاد۔۔۔ اصل میں تو سرکار کو ان منشی صاب کی صورت سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ روتی صورت۔۔۔۔۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بری خبر سنائے۔۔۔۔۔ کو تیار

کالی زبان۔۔۔ اور پھر وینکٹ ریڈی کے نام پر انہیں یہ بھی یاد آیا کہ مجرے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔

”تو منشی صاب ! آپ آج ہی چیکنٹ پہلی جاؤ، اور اس گدھے کے بجے سے دو ہزار روپے لے آؤ۔“

”مگر سر کار انے پہلے ہی بول دیا تھا کہ بے نشان آم کی امرئی نہیں لکھے تو ایک روپسی بھی نہیں دوں گا۔“

اونہ۔۔۔ لکھ دو۔۔۔“ سر کار نے لا پرواہی سے کہا۔

سال میں صرف ایک ہی بار تو آم آتے ہیں۔ اگلے سال انشاء اللہ ساری جائیداد اس سالے سے واپس لے لوں گا۔“ انہوں نے منشی صاب کی طرف یوں شان سے دیکھا جیسے ربن والی تمام جائیداد حاصل کر کے منشی صاب کے سامنے پٹک دی ہو۔

منشی صاحب نے بھی اس پر غور کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ اگلے سال انشاء اللہ روپوں کی فصل کو نسے کھیت میں۔۔۔ اُگنے والی ہے

دیوالی کی رات وینکٹ ریڈی کا گھر جسے بھگوان نے سونے کی لکیروں سے اجال دیا تھا۔ چھت کی منڈیر میں اور دروازے کھڑکیاں رنگین قمقموں سے جگمگا رہے تھے، آج چیکپ پلی کی پہاڑیوں کو پار کرتے ہی رنگا ریڈی کی وینکٹی کا اونچا مکان سب سے پہلے نظر آجائے گا۔ گاؤں کے باقی گھروں کے آگے بھی دس پانچ دیئے ٹمٹمارہے تھے۔ سسک رہے تھے۔ یوں جیسے وینکٹ ریڈی کے گھر والی روشنی دیکھ کر جلنا نہ چاہیں۔

آج رتنائے وینکٹی کو گھر پر روکنے کی بڑی کوشش کی تھی۔ کیونکہ وہ آج رات رنگا ریڈی کے ہاں جوا کھیلنے جانے والا تھا۔ رنگا ریڈی آج کسی اور نئی رنڈی کا ناچ نہ دکھا دے۔ رتنائے ربی تھی۔ شام ہونے سے پہلے پوشمّا نے نہا دھو کر پوجا کا تھال سجایا۔ رتنائے بچوں کو نہلا کر نئے کپڑے پہنائے۔ پھر اس نے اپنی مانگ میں سیندور ڈالا۔ ہاتھ پیر ہلدی سے رنگے۔ دھرم ماورم کی نئی چپکتے بارٹر والی ساری پہن کر جوڑے میں گیندے کے پھولوں کی بینی سجائی اور پھر تعجب سے... منہ کھولے سلیم کو دیکھا جو اسے گھور رہا تھا... تب وہ ہنس پڑی

رتنائے... کچھ دیتی کیا...؟“ وہ بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلائے آگے بڑھا۔ ’ ’

وہیں ٹھہرا... جوکے میں نکو آو بولی تھی نا میں .....“ پوشمّا نے اسے ڈانٹ دیا... پوشمّا کو سلیم کا گھر میں آنا جانا ” اچھا نہیں لگتا تھا..... جب وہ کھیتوں سے تر کاری یا لکڑیاں لے کر آتا، بکریوں کو جنگل سے واپس لے کر آتا تو بڑی دیر ..... تک رسوئی کے دروازے پر کھڑا رتنا سے باتیں کہے جاتا تھا

انس کریم کسے کہتے ہیں..... چلتی پھرتی تصویروں کا تماشہ کیسا ہوتا ہے۔

شہر میں کیسے ٹھاٹ کرتے ہیں..... رتنائے زندگی کے کتنے اسرار و رموز سے آگاہ کر رہی تھی۔ پھر جب کہنے کو کچھ باقی نہ رہتا تو رتنائے اسے کوئی نہ کوئی کام تھما دیتی تھی۔

لکڑیاں پھوڑ دے..... بازار سے پھول لا دے۔ بچے کو ڈھلا دے۔ چولہا پھونک دے اور وہ جلدی جلدی یوں کام کرتا جیسے وہ بھی اپنے باپ کی طرح اس گھر میں رہن ہو گیا تھا۔ رتنا کے ہاتھوں بک چکا ہے۔

پھر رتنائے بھی اس کے ساتھ برتن دھونے بیٹھ جاتی..... صبح سویرے سلیم آنگن میں گوہر کا چھڑ کا وکرتا تو رتنا رنگولی بناتی تھی۔

ایک دن سلیم نے رتنا کی کھنگی چھپادی۔ کھنگی چھپنے کے لئے اس نے رتنا کو سارے گھر میں دوڑایا۔ اسی وقت ملیشّم وینکٹی کے ساتھ اندر آیا اور آتے ہی اس نے سلیم کو گھور کے دیکھا۔

ابے او چھو کرے۔ ہر وقت گھر میں کیوں گھسا رہتا ہے“ اور اس نے پھر پلٹ کر وینکٹی سے کہا... ”انا (بھائی) یہ ” چھوکرا تو اب بڑا ہو گیا۔ اسے کھیتوں کے کام پر کیوں نہیں لگاتے؟ یہ مسلمان پوٹوں کو گھر میں نکو آنے دو۔ آپ کو کیا معلوم “حیدرآباد میں بڑے دنگے ہو رہے ہیں۔

اور پھر اس نے گوری چمکتی دمکتی رتنا کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہا۔ اس کے بعد جھک کر پاؤں چھونے کی بجائے رتنا کے پاؤں پکڑ لئے۔

نمسکارم بھابی ..... جان ..... مسلمان لوگ بھابی کو جان کہتے ہیں۔

بابا... اتنی اچھی بھابی ہو تو جان کہنا ہی پڑے گا...“ وہ ندیدی نظروں سے رتنا کو گھورنے لگا تو وہ گھبرا کے رسوئی میں بھاگی۔

میری طبیعت اچھی نہیں ہے رے ملیشّم..... پوشمّا بستر سے اٹھ کر کراہنے لگی۔ تب ملیشّم کو یاد آیا کہ اسے پہلے ” ماں کے پاؤں چھونا چاہییں۔ بھول ہی گیا۔

میں آگیا..... بس اب تو ٹھیک ہو جائے گی۔ بہت اچھی دوا لایا ہوں تیرے لئے“..... اور پھر وہ کمرے میں ”  
ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

بھابی..... جان..... کیا کھلاؤ گی مجھے قسم سے بہت بھوکا ہوں ایک مہینے ”  
”سے تمہارے ہاتھ کے کھانے کا انتظار کرتا رہا ہوں۔

وینکٹی دیور اور بھابی کے بیچ کچھ نہ بولا... وہپ سے آکر اپنے تخت پر بیٹھ گیا اور دھوتی کے پلو سے پنکھا کرنے  
لگا..... سالی گرمی پیچھا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اور کتنی مکھیاں اس کی جان کو چھٹ گئی ہیں۔

پوشما نے جلدی سے اٹھ کر گھی کی بانڈی اتاری۔ سلیم سے ایک مرغ کٹوا یا اچار نکال لائی... چولہے کئے دو چوکیاں  
بچھا کر باسمتی چاول کا خشک نکالا... مگر مجال تو ہے کہ رتنا وہاں آئی ہو..... اسے ملیش سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ اور ایک بار  
کھی کھی کرنے پر وینکٹی نے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ مٹی سے ہنسی مذاق کیوں کرتی ہے۔

دونوں بھائی کھانے بیٹھے تو ملیش نے پھر ادھر ادھر دیکھا۔

”ارے بھابی، جان..... آج امباڑے کی بھاجی نہیں بنائی تو نے؟“

بابر آنگن میں تلسی کے پودے تلے رتنا سلیم کے پاس بیٹھی جوار صاف کر رہی تھی۔

دونوں کسی بات پر خوب فنس رہے تھے۔

انا (بھائی) اس مسلمان پوٹے کو اب گھر میں نکو آنے دو۔ کام کرنے کے لئے اس ”

کی کوئی بہن نہیں ہے کیا.....؟“

”ہے تو“..... وینکٹی نے خواجہ بی کی یاد کر کے چٹخارہ لیا..... یہ چٹنی بڑے مزے کی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وینکٹی، رنگاریڈی کے ہاں جانے کی تیاری کر رہا تھا تو اسے دالان مینپھر کسی کے ہنسنے اور بھاگ  
دوڑ کرنے کی آواز آئی۔

سلیم...؟ اس نے غصہ میں پکارا۔

سلیم چلا گیا انا..... ہم ذرا بھابی سے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ بچاری اکیلے گھر میں پڑے پڑے تھک جاتی ہوگی۔ اب ”  
کی گرمیوں میں بھابی کو لے کر حیدرآباد آؤ انا۔ بھابی جان کو گنڈی پیٹ کے تالاب میں نہلائیں گے۔ اب کی بار تمہاری گنے کی  
”فصل تو زور دار ہے۔ خوب کماؤ گے۔ تھوڑا سا خرچ بھی کر ڈالو۔

اور پھر وہ بھابی کے پیسوں کی تھیلی انگلیوں سے گھماتے میں آہستہ سے بولا۔

”ارے ہاں... وہ مزیدار چٹنی کہاں ہے۔ آج ہمیں بھی چکھاؤ نا۔“

بھاگ یہاں سے... ”وینکٹی نے جھوٹ موٹ کے غصہ سے بھائی کو ڈھکیلا۔“

تم سالے چھو کرے۔ شہر میں ایک سے ایک ترمال اڑاتے ہو۔ اور پھر گاؤں کی چٹنی یاد آتی ہے ! ابے او سلیم... وہ ”  
جو تیری بہن ہے نا خواجہ۔ اس کو بول آج دیوڑھی میں جھاڑو لگانا ہے۔ شام کو..... مہمان آئیں گے... جاؤ بیٹا... تمہارے  
عیش کا سامان ہو گیا ہے...“ اس نے آہستہ سے ملیش سے کہا اور بستہ سنبھال کر باہر چلا گیا۔

سلیم کو پکارتی ہوئی احمد بی ریڈی کے گھر تک چلی گئی۔

! خوف کے مارے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آج جانے کیا ہونے والا ہے۔

کوئی خاص چیز نہیں۔ بچے کے لئے تحفے ہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا اور آگے بڑھا ... آگے بڑھتے ہوئے رنگا ریڈی ' کے جوتوں پر سارے مجمع کی نگاہیں تھیں۔ اس کے چمکیلے جوتوں میں چاندی کے گھنگر داور موتیوں کی جھال لگی تھی۔ یہ

فیشن سب سے پہلے پائیگاہ کے راجوں نے نکالا تھا اور اب رنگاریڈی جیسے چھٹ بھپوں تک آ گیا تھا۔ اس کے پیروں پر نظر پڑتے ہی وینکٹ ریڈی تلملا کے رہ گیا۔

رنگاریڈی نے وینکٹ ریڈی کے گھر میں قدم رکھا۔

ٹٹی کی آڑ میں سے جھانکتی ہوئی پوشما کے جیسے دل پر اس کا پاؤں پڑا جانے رنگاریڈی کا ان کے گھر آنا کونسا حادثہ ہوگا۔۔۔ ان دونوں خاندانوں میں تو پکی دشمنی تھی۔ پھر بھی اوپری جی سے دوستی کرنے ، کوئی نہ کوئی مات کی چال ڈھونڈنے کے لئے۔

مستان تو جیسے رنگاریڈی کی موتیوں والے جونیوں کے پاؤں اپنی ہتھیلی پر رکھتا ہوا اندر تک لے آیا۔

مگر سب مہمانوں کے بیچ میں بیٹھنے کی بجائے رنگا ریڈی وہاں لے جایا گیا، جہاں سرتاج کے ساتھ وینکٹ ریڈی اور ملیشیم کے کچھ خاص دوست بیٹھے تھے اور شہر سے منگوائی ہوئی اسکاچ کا دور چل رہا تھا۔ رنگا ریڈی نے گلاس اٹھایا۔ مگر سرتاج کی مخمور آنکھوں نے اس کی سدھ بدھ کھو دی تھی۔

پھر کھانے کی بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ رنگاریڈی نے کھانا کم کھایا مگر ..... زیادہ۔ اس کے قہقہے پورے نلگنڈے میں مشہور تھے کہ آدھا گاؤں گونج اٹھتا تھا۔ طنز سے بھرا، فتح سے بھرا اور مصلحتوں سے بھرا، لمبا قہقہہ ، کہ سننے والا سہم جائے مگر ہنسنے پر مجبور ہو۔

یوں تو وہ بھی کبھی کبھار حیدر آباد عیش کرنے جاتا تھا۔ مگر وینکٹ ریڈی جیسے گنواروں کی چھوٹی رنٹیوں کی طرف اس نے کبھی رُخ نہیں کیا تھا۔ لیکن آج تو وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔۔۔ کھانے کے بعد سرتاج نے مبارکبادی کے بعد ناچ ، ، ، ، ، شروع کی۔۔۔ ”پی لے پی لے مورے راجہ۔۔۔۔۔ ہو مورے راجہ

رنگاریڈی بار بار اس کی طرف دس روپے کا نوٹ بڑھاتے جارہا تھا۔۔۔۔۔ سرتاج کو

مہلت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ کسی اور کی طرف دیکھ کر بھی بھاؤ بنائے، قوالوں اور رنٹیوں کو نذرانہ دینا مہذب محفل کا اصول ہے مگر وینکٹ ریڈی کو ذرا اچھا نہ لگ رہا تھا کہ سرتاج صرف رنگا ریڈی کی طرف منہ کر کے ہی ناچے جائے۔

محفل ختم ہوئی تو رنگاریڈی بہت خوش تھا۔

”تو اب کی دیوالی کی پارٹی میں ہمارے ہاں ضرور آنا، آپ دونوں بھائی، وینکٹ ریڈی گارد ، اور ملیشیم ریڈی گارو“ ، ، ،

”ضرور ضرور۔۔۔۔۔“ ان دونوں نے ہنس کر کہا۔

ان کے جانے کے بعد جب وینکٹ ریڈی سرتاج کے ساتھ لیٹا تو اس نے سوچا۔

آج وہ خوب جلا ہے۔ اسے معلوم ہوا کہ باپ دادا کی جائیداد پر اکڑنا کیسی حماقت ہے۔ ہم نے یہ دولت خود کمائی ہے۔ اب کی دیوالی پر اس کا دیوالیہ نہ نکال دوں تو نام بدل دینا۔ سرتاج کو دیکھ کر تو جل کر کباب ہو گیا۔۔۔ آج میں نے اسے رتنا بھی دکھا دی۔ آج رتنا بھی کیا غضب ڈھا رہی تھی۔ حیدرآباد سے منگوائی ہوئی اس نے سرخ پوچم پلی کی ساری پہنی تھی۔ ہاتھ پیروں کو ہلدی لگا کر اس نے اپنے دودھیا رنگ کو اور اجال دیا تھا۔ اتنی خوبصورت رتنا اسے ابھی تک کبھی نہیں لگی تھی۔ اور یہ خوبصورت دل میں اُتر جانے والی رتنا اس نے رنگاریڈی کو دکھائی تھی تا کہ وہ ساری رات سرتاج اور رتنا کی یاد کر کے سر پٹکتا رہے۔

سرتاج اس کے پاس دو برس سے تھی۔ ہر مہینے سو روپے وہ حیدر آبادمستان کے ہاتھ بھجوا دیا تھا لیکن آج سے پہلے اس نے گاؤں میں سرتاج کا مجرا بھی نہیں کیا تھا کیونکہ اس نے رتنا کے سامنے قسم کھائی تھی کہ وہ کبھی رنٹی کو گھر نہیں لائے گا۔ اس لئے سرتاج ہر اتوار کی رات کھیتوں والی دیوڑھی میں آتی تھی۔ ہفتے کی رات مستان وہاں جا کر مرغ پکا تا شراب کی بوتلیں لاتا اور کمرہ صاف کرتا تھا۔

مگر سرتاج ہمیشہ اتوار کے دن ہی کیوں آتی ہے.....؟ ایک بار احمد بی نے مستان سے پوچھا تھا۔

اگے بولی.... بفتے اور منگل کے دن ریڈی لوگ روزہ رکھتے ہیں نا۔ کیا وینکٹی

‘ ‘ ..... گار و کوروز و نکو رکھو بولتی کیا تو

اور احمد بی سر پر پلو ڈال کر بڑی عقیدت بھری آواز میں کہتی۔

ہو جی۔ بچارا بڑا نیک آدمی ہے۔ کبھی روزہ ناغہ نہیں کرتا، اللہ اس کا پیٹ ٹھنڈا رکھو۔ اس کی آل اولاد سکھی رہے۔

چپ بیٹھ گئے اماں ، بہت دی تو دعائیں.....“ سلیم آنگن میں کھڑا موٹی لکڑیوں

پر پاؤں رکھ چیر چیر کے پھینک رہا تھا۔

باوا کو تو چھوڑتا نہیں اجاڑ صورت۔ میں برس سے پھوٹ میں کام لے رہا ہے۔ اور تو اُس کو دعائیں دیتی ہے۔

اگے چپ بیٹھ گئے پوٹے..... احمد بی نے ماتھا پیٹ لیا۔

وہی تو ہمارا پیٹ بھرتا ہے۔ اپنے سابوکار کو گالی دے کر تو کہاں رہے گا اجاڑ صورت ! کیا گاؤں سے باہر جانے کا ارادہ ہے تیرا.....؟

اب کی تو ایسی بات بولا تو کلہاڑی سے چیر دوں..... مستان کے دبلے پتلے مریل سے لڑکے مراد نے کہا۔

جو سابوکار کی بیگار کرتے کرتے کبھی کا کلہاڑی سے چیرا جا چکا تھا۔



دیوالی کے دیئے یوں آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ جیسے آج انہوں نے کوئی بالکل نیا تماشہ دیکھا ہو۔ جیسے وہ کسی انہونی پر خوف کے مارے کانپ رہے ہوں۔ ادھر بچوں کے پٹاخوں نے جیسے پرسکون دل دہلا دیئے تھے۔

دیوں کی بتیوں نے جب سارا رس چوس لیا اور چراغ بھڑک بھڑک کے بجھنے لگے تو

رنگا ریڈی اور وینکٹ ریڈی دوستوں کے ساتھ کارڈ پھیلا کے بیٹھ گئے۔ وینکٹ ریڈی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ بہت کم پیتا تھا۔ اور جب سے ایک بار اس کا جگر خراب ہوا تھا، اس نے شراب کی بجائے عورت کے نشے کو ترجیح دی تھی۔ مگر آج وہ رنگا ریڈی کے محبت بھرے اصرار کو ٹال نہ سکا۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ مجھے خوب پلا کر وہ..... خوب رو پیہ جیتے گا۔... مگر تجھے مزہ چکھاؤں گا آج

وہ اپنے سلک کے کُرتے کی آستین چڑھا کے بیٹھا تو رنگا ریڈی نے جھومتے ہوئے کہا۔

وینکٹ گارو... روپے سے کھیلنے میں مزہ نہیں آ رہا ہے۔ گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی کی بازی لگاؤں گا میں”  
، ، ...

واہ واہ..... کیا بات ہے رنگا ریڈی گاڑ و.....“ وینکٹ ریڈی نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملائے اور پھر لڑکھڑا کے اس ”  
کے قدموں میں گر گیا۔

... رنگا ریڈی گارو..... مجھے معاف کر دو.....“ میں تمہیں اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ مگر تم تو میرے دوست نکلے”  
، ، ...

وینکٹ ریڈی کے قہقہے اندر کمرے تک گئے جہاں رنگا ریڈی کی بیوی سو رہی تھی۔

بونہ..... دو ٹکے کا دھیڑ۔ بہت اکڑ رہا ہے آج جیت کر..... اس کے شوہر نے ایسے دولتیے لوگوں سے دوستی  
کیوں بڑھائی ہے۔ اب میں اسے کبھی یہاں نہیں آنے دوں گی..... اس نے کروٹ بدل کر سوچا۔

پھر رفتہ رفتہ رنگا ریڈی کے قہقہے اونچے ہونے لگے۔ آتش بازی کے انار کی طرح اس کے اونچے فتح یاب قہقہے  
فضا میں ہر طرف اُجالا سا بکھرا رہے تھے، اور ہر بار اس کی بیوی بے چینی سے کروٹ بدل لیتی... اچھا ہوا، آج وینکٹی بہت  
یاد آ رہا ہے۔ مگر وہ تو پرانا دشمن ہے اس خاندان کا جانے کیا لوٹ کر لے جائے گا۔

صبح خوف سے کانپتے ہوئے مستان نے پوشما کو بتایا کہ رات ریڈی رنگا ریڈی کے ہاں رتنا کو اور اس گھر کو ہار آیا  
ہے۔ اسے خوب پلا کر رنگا ریڈی کے دوستوں نے بے وقوف بنادیا۔ اور جاتے جاتے دھوکے سے دستخط بھی لے لیے ہیں۔

پوشما کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

رتنا کو داو پر لگا دیا..... بے غیرت..... بے حیا..... اوہ یہ گھر ہار

بیٹھا..... یہ گھر جو اس کے باپ دادا نے ایک ایک اکنی جوڑ کر بنایا۔ یہاں اس کی ساس بن کر آئی۔ پھر خود پوشما نے قدم  
رکھا۔ پھر وینکٹی کی شادی کا منٹوا پڑا۔ اور پھر اس کی بیٹیوں کے دولہا آئے۔ یہ گھر وینکٹی ہار گیا۔ رنگا ریڈی اب آتا ہوگا۔ رتنا

کا ہاتھ پکڑ نے ہم سب کو گھر سے باہر نکالنے... کہاں ہے وہ ماٹھی ملا... اجاڑ صورت۔ باپ دادا کی عزت جوئے میں ہارنے والا۔ اسے منع کری تھی میں کہ دشمنوں میں مت جا..... پھر پہنچ گیا سانپ کے گھر میں ہاتھ ڈالنے۔

اس نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر دیکھا۔

سناتا پورے گاؤں میں گونج رہا تھا۔ جنگل کی طرف سے گیدڑوں اور کتوں کے رونے کی آواز میں آرہی تھیں..... پھر اس نے دیکھا گھر کے پیچھے سے تین گھوڑ سوار گلی میں آئے اور گاؤں سے باہر جانے والی سڑک گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔ پوشمآ کے چاروں طرف دھول اڑ رہی تھی... گھوڑے ہوا کی طرح دوڑتے ہوئے پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔

...رتنا.....رتنا..... تیرا پتی جارہا ہے..... اسے روک لے۔ اسے مت جانے دے..... وہ آج خون کرنے گیا ہے”  
، ، ...

اور چھاتی پکڑ کے پوشمآ دھڑام سے آنگن میں گر پڑی۔

نلگنڈے کے جنگل اپنی پھول بھلیوں کے لئے مشہور تھے۔

او برکھاڑ راستے ، چلتے چلتے نظر اٹھاؤ تو کوئی پہاڑی راستہ روکے کھڑی ہوئی۔ آگے راستہ کہاں ملے گا.....  
بچاؤ کی راہ کدھر ہے۔

گھور اندھیارا... ہولناک سنائے میں کتے بھی آواز نکالتے ہی رُک جاتے۔ جیسے خوف سے وہ کانپ رہے ہوں۔ جنگل  
میں آدھی رات کی ہوائیں بھری ہوئی چڑیل کی طرح چلا رہی تھیں۔

جانے آج کس کی موت آتی ہے۔ آدھی رات کو اُلو باغ میں چلا رہے ہیں۔

رنگاریڈی کی بیوی نے اکیلے پلنگ پر کروٹیں بدلتے ہوئے سوچا۔

رنگاریڈی گھر پر نہیں تھا..... دو کوس دور نلہ کنٹہ گیا تھا کسی مقدمے کے لئے۔ اور دو کوس دور نلہ کنٹہ میں  
جنگل کی ہوائیں رنگاریڈی کو دبلانے دے رہی تھیں۔ آج وہ اس گاؤں میں سرتاج کے ساتھ رنگ رلیاں مانے آنا تھا۔ دل بہلانے کو  
اسے کبھی عورت کی کمی نہیں تھی۔ وہ بھی حیدر آباد عیش کرنے جاتا تھا کہ اس کے باپ دادا کی روایت تھی۔ مگر اس نے  
وینکٹ ریڈی جیسے لوگوں کے منہ لگائی ہوئی طوائفوں کی طرف کبھی رُخ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس دن وینکٹ ریڈی کی ہاں  
سرتاج کو دیکھ کر تو وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر گیا تھا اب وینکٹی سے دوستی ختم کر کے لوٹے گا۔ مگر  
سرتاج کے گھنگھروں نے اسے باندھ لیا۔ تیسرے دن وہ محبوب کی مہندی میں سرتاج کے کوٹھے پر پہنچا اور اس کے مجرے  
کی فرمائش کی۔ بڑی دیر کی تکرار کے بعد سرتاج کی ماں نے زینے کا دروازہ بند کروایا۔ دالان کی بجائے سازندے کمرے میں  
بیٹھے۔ یوں جیسے پہلی

بار کنواری بالی سرتاج کو رنگاریڈی کے سامنے لا رہی ہو۔ اور پھر جاتے وقت سو کا نوٹ لے کر سلام کے بعد بولی۔...” اب  
”دوسرے وقت آپ ادھر نکو آؤ۔ وینکٹ ریڈی ہم کو جان سے مار دے گا۔“

نائیکہ کی یہ بات رنگاریڈی کے سر پر چڑھی اور تلوے سے نکلی۔ وہ جیسے گرم تیل میں نہا گیا۔ سالی دو ٹکے کی  
رنڈی اور مجھے وینکٹ ریڈی سے ڈرا رہی ہے۔ ارے میں اس کی جو رو کو نہ اٹھالوں تو نام بدل دینا میرا۔

تب آخری سیڑھی اُتر کے اس نے خرائٹ بڑھیا سے پوچھا

..... ‘ ‘ کیا دیتا ہے تمہیں وینکٹی ؟ ”

ہر مہینے دیڑھ سو روپے بھیجتا ہے۔ اور کئی کئی مہینے آتا بھی نہیں۔“ بے ایمان بڑھیا نے ”

پچاس روپے کا اضافہ کر کے کہا۔

لو یہ دو سو روپے۔ دیوالی کے دوسرے دن اسے نلہ کنٹہ بھیج دینا۔ اور ہاں اس بات ”

“.....کی خبر وینکٹی کو نہ ہونے پائے۔

آج وہ رات اگنی تھی۔ سرتاج اس کے پاس تھی۔ آج سرتاج کے حسن کا نشہ اتر چکا تھا..... بس وہ تو وینکٹی سے انتقام کے نشہ میں چو رہا تھا۔

اس نے سرتاج سے کہا... کل اس کمرے میں وینکٹی کی بیوی رتنا ہوگی۔

بہت پی لی ہے کیا آج ...“سرتاج نے اس کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے بلایا۔ ”

“وینکٹی اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا۔ بالکل دیوی کی طرح ہے وہ عورت۔ اس کا نام مت لو۔ وینکٹی مارڈالے گا تمہیں۔”

دھا نیں دھائیں..... سارا کمرہ بارود کی بو سے بھر گیا۔

دور گاؤں میں سونے والوں نے بندوق کی آواز سنی۔ پھر وہ سب اس گھر کی طرف دوڑے۔ مگر تین گھوڑے اپنے پیچھے دھول کا غبار چھوڑتے ہوئے اونچی پہاڑیوں کی سمت بھاگ رہے تھے۔ یوں جیسے وہ پہاڑیوں کے سہارے اوپر آسمان تک چلے گئے ہوں۔

لوگ رنگا ریڈی کے کمرے میں گئے، مگر اس کی خاک و خون میں ڈوبی ہوئی لاش کو اٹھانے کی بجائے آنکھیں نیچی کر کے لوٹ آئے۔ کیونکہ سرتاج کی لاش برہنہ تھی۔ اللہ توبہ..... بھگوان معاف کرے..... بُرے کام کا بُرا انجام..... کوئی رنڈی کا عاشق ہوگا..... دوڑو..... بھاگو..... پکڑو..... پکڑو..... آدھی رات کے اندھیرے میں رونے پیٹنے کی آوازیں..... ہواؤں کی چیخوں میں مل گئیں..... دور دور تک گاؤں والے سوتے سوتے جاگ پڑے

کسی گاؤں میں ڈاکہ پڑا ہے آج۔

دوڑو..... پکڑو..... پکڑو..... رنگاریڈی کے بیوی بچے چلاتے رہے۔

مگر گزرتے ہوئے وقت کو کس نے پکڑا ہے.....؟

چیکٹ پلی میں ابھی اُجالا نہیں ہوا تھا۔ چیکٹ پلّی میں اُجالا بہت کم آتا تھا۔ کبھی بالکل نہیں آتا۔ گھور اندھیرے میں ایک جھنگر سانس لئے بغیر چلانے جارہا ہے۔

دور کہیں کسی گاؤں میں کوئی ہندو مر گیا ہے۔ شہنائی کی اُداس لّیے اور دھبڑے کی دھم دھم مستان کے سینے پر لگ رہی تھی۔ وہ کھیتوں والی دیوڑھی میں دیوار سے پیٹھ لگائے اکیلا بیٹھا جاگ رہا تھا۔ ہر آہٹ پر بابر پھیلے ہوئے اندھیرے میں کچھ ڈھونڈتا اور پھر بیٹھ جاتا۔... آج اس نے دو پہر سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ بچے اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ اس کے سامنے وہ پلنگ بچھا تھا جس پر سرتاج سویا کرتی ہے۔ اور پھر ایک دن وینکٹی نے اسی پلنگ پر اس کی بیٹی کی عزت لوٹ لی..... تھا۔ مستان کے آگے ایک فلم چل رہی تھی۔ اسے اپنی بیٹی کا معصوم چہرہ یاد آیا اور پھر

‘ ‘ حرام زادے... سو گیا کیا؟...؟ ”

وینکٹ ریڈی کی چنگھاڑ پر وہ چونک پڑا۔

تیرے کو کیا بولا تھا میں۔ گھوڑا لے کر یہاں تک نہیں آؤں گا..... پوچھا کے ”

”دیول کنے ٹھہر نا۔“

تایڈ توڑ اس نے دو تین لائیں اس کے پیٹ پر ماریں ، اور اس کی ٹھوکروں کو ہاتھوں سے بچاتا ہوا مستان باہر کی طرف بھاگا۔

پھر وینکٹ ریڈی نے اسے دھنگروں (چرواہوں) والا سیاہ اُون کا کمبل اوڑھایا گھوڑے پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پیر ڈھانپے اور پیچھے گھانس لا دی۔ کیونکہ اب صبح ہونے والی تھی..... جب مستان گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے گھر کے قریب سے گزرا تو احمد بی چکی پر اناج پسینے بیٹھ چکی تھی۔

.....ندی جاتی بھاری پانی ہے اتارو

.....پھر بندہ نواز و، تیر و میرا جہازو

حیدر آباد پہنچ کر اس نے ریڈی کی ہدایت کے مطابق گھوڑے کو وہ دوا پلا دی جو اسے ریڈی نے دی تھی۔ اور جب گھوڑا خوب قے کرنے لگا تو اسے وٹرنری ہاسپٹل میں شریک کر کے صبح سات بجے کی بس سے گاؤں لوٹ آیا۔ آج وہ ریڈی کے گھر جانے کی بجائے اپنے گھر میں پڑا سوتا رہا۔ احمد بی کو بڑا تعجب ہوا کہ آج اسے دن میں سونے کی اجازت کیسے مل گئی۔ شام ڈھلے مستان کی آنکھ کھلی۔ بچوں کا شور مچا ہوا تھا اور سب باہر کی طرف بھاگے جارہے تھے۔

گاؤں میں پولیس کی دوڑ آتی تھی۔ سارا گاؤں انسپکٹر کی جیب کو دُور دُور سے دیکھ رہا تھا اور یوں گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتا تھا جیسے وہی قاتل ہو۔ پھر بھی پولیس والوں کے بھاری جوتوں کی آواز پورے گاؤں میں جیسے گونج اٹھی تھی۔ پھر وہ سب وینکٹ ریڈی کے دروازے پر پہنچے..... وینکٹ ریڈی کی تیز بخار میں کا نپتا بلانکٹ اوڑھے کر ابٹا ہوا اُٹھا۔

‘ ‘ کیا بات ہے...؟ ”

‘ ‘ آپ کا سیاہ گھوڑا کہاں ہے...؟ ”

کالا گھوڑا... وہ تو تین دن سے ہاسپٹل میں ہے حیدر آباد کے کئی مہینے سے بیمار تھا۔ ہاسپٹل کی چٹھی بتاؤں ‘ ‘ کیا..... مگر خیر تو ہے!..... کیا ہوا..... آپ لوگ ہمارے گاؤں میں کیوں آئے ہیں آج ؟

...وینکٹ نے گھبرے کے پولیس والوں کو دیکھا

ا بے اومستان کے بچے... کہاں مر گیا... آپ لوگوں کو اندر بیٹھک میں لا کر بٹھا..... مجھے تو اٹھ دن کے بخار ” نے توڑ ڈالا ہے۔ میں تو کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔ جلدی سے کھانا تیار کراؤ..... اور جب تک کچھ منہ کا مزہ بدل لیں آپ لوگ۔ ‘ ‘ غریب آدمی ہوں۔ مگر آپ کو آپ کی پسند کی چیز مل جائے گی..... اندر تشریف لائیے سرکار

اور پولیس والوں کی بھاری جوتیوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتا وہ اپنی بیٹھک میں لے آیا۔

رنگاریڈی کا نلہ کنتھ میں قتل ہو گیا ہے.....“ انسپکٹر نے منہ سے پسینہ پونچھتے میں کہا۔

...رنگاریڈی کا... وینکٹ ریڈی اپنی جگہ سے اچھل پڑا

نہیں نہیں...“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر چلایا... کھڑا ہوا پھر دھڑام سے بیٹھ گیا۔ پھر سینہ پکڑ کے لیٹ گیا... اس کی ” طبیعت خراب ہونے کی اطلاع مستان نے پوہنا کو دی تو پوشما اور رتنا دوڑتی ہوئی باہر آئیں۔

وینکٹ...وینکٹ...نچھے کیا ہو گیا بیٹا...“ اس کی ماں نے جھنجھوڑ ڈالا... وہ گھبرا کر پولیس والوں کو دیکھنے ” لگی.....

مجھے کچھ نہیں ہوا ماں ، مگر رنگاریڈی..... میرا دوست.....“ وہ سینہ تھام کر بولا۔ ”

انسپکٹر نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا..... ساری بیٹھک میں سفید اجلی چاندی کا فرش تھا۔ دیواروں سے لگے ہوئے موٹے موٹے چوکور تکیے رکھے تھے۔ سامنے کی دیوار پر سنہرے فریم میں لگا بڑا سالارڈ وینکٹیشورا کا فوٹو لگا تھا۔ اس کے نیچے اسٹینڈ پر اگر بتی جل رہی تھی۔ فوٹو کے فریم پر صندل کے پھولوں کا بار تھا۔ دوسری دیوار پر بنومان جی اپنی دم سے ساری لنکا کو جلانے تیار بیٹھے تھے... آس پاس وینکٹ ریڈی کے باپ دادا فریموں کے پیچھے سے جھانک رہے تھے۔ گاؤں والوں کی طرح، جو وینکٹ ریڈی کے دروازے پر کھڑے انتظار کر رہے تھے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

کچھ تو بتائیے انسپکٹر صاحب یہ کیسے ہو گیا... کس نے قتل کر دیا اتنے اچھے آدمی کو... پرسوں دیوالی کی رات ”  
”وہ میرے ساتھ تھا۔“

”ابھی کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔ گاؤں والے کہتے ہیں۔ قاتل گھوڑے پر آئے تھے۔ ایک گھوڑا کالا تھا۔“

اچھا۔ تو اسی لئے آپ میرے کالے گھوڑے کو پوچھ رہے تھے... ہاں تو آگے سنائیے۔ یہ تو کچھ پرانی دشمنی معلوم ”  
ہوتی ہے۔“ وینکٹی نے کراہتے ہوئے کہا۔

پتہ نہیں..... انسپکٹر صاحب سر کھجانے لگے۔“

قتل کے وقت حیدر آباد کی ایک رنڈی سرتاج بھی تھی کمرے میں۔ قاتلوں نے اس پر بھی فائر کر دیا..... شاید کچھ ”  
‘ ‘... پرانی رقابت تھی

ارے نہیں انسپکٹر صاحب... وینکٹی نے انسپکٹر صاب کی بات بیچ میں سے کاٹ دی۔“

اب سرتاج میں کیا رہا ہے کہ غنڈے اس کے لئے قتل کرتے پھریں گے۔ وہ تو بڑھیا گئی ہے۔ ایک زمانے میں تو ہم ”  
بھی اس کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ مگر اب تو سال بھر سے میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مجھے تو یہ رنگا ”  
ریڈی کی دوسری بیوی کے رشتے داروں کی کارستانی لگتی ہے۔

دوسری بیوی...“ انسپکٹر نے اپنی کاپی میں لکھتے لکھتے رک کر پوچھا۔“

ہاں...“ اب وینکٹی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اپنی بیماری بھول گیا ہو۔“

اس نے حیدر آباد کے ایک جاگیردار کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ ویسے ایک راز کی بات بتاؤں آپ ”  
”کو...! رنگاریڈی تو مسلمان ہو چکا تھا۔“

اچھا...؟ یہ کب...؟“ انسپکٹر کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔“

ارے یہ تو لمبی کہانی ہے۔ آپ میرے حوالے سے کچھ مت لکھئے سرکار۔ میں سیدھا“

سادھا آدمی ہوں۔ پولیس کچہریوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ اور وہ تو میرا دوست تھا..... ابو دیوڑا... اب میں اکیلا رہ گیا ہوں..... مستان..... اومستان..... تھوڑی سی برانڈی لے آ۔ آپ لوگ بھی تھک گئے ہوں گے سرکار... افوہ... میرے سینے ”  
”میں پھر درد شروع ہو گیا۔“

جتنی دیر میں شراب کی بوتلیں کھلیں۔ وینکٹی اٹھ کر اپنی دوالا نے اندر گیا۔

پھر وہ ایک رومال میں سگریٹ کے پیکٹ رکھ کر باہر آیا۔

انسپکٹر صاب، اس گاؤں میں آپ کو اس سے اچھے سگریٹ نہیں ملیں گے۔ یہ خاص طور سے آپ جیسے مہمانوں ”  
‘ ‘..... کے لئے رکھتا ہوں سرکار

سگریٹوں کے پیکٹ اتنے وزنی تھے کہ انسپکٹر بوجھ کے مارے بینکٹی کے آگے جھک گیا۔

گاؤں کے باہر کھلبلی سی مچی ہوئی تھی کہ ریڈی کے ہاں پولیس کی دوڑ آئی ہے۔ پھر مستان نے سب کو بتا دیا کہ رنگاریڈی کی کسی نے قتل کر دیا۔

ہے بے کتنا بڑا آدمی تھا وہ... چاندی کے موتیوں والی اس کی جوتیاں ابھی تک گاؤں والوں کی نظروں میں جگمگا رہی تھی۔ پولیس کی دوڑ ہمارے گاؤں پر آئی ہے تو جانے کیا عذاب نازل ہوگا۔ سب اپنے اپنے دروازوں پر سہمے کھڑے تھے۔ کئی گھنٹوں کے بعد انسپکٹر صاحب مرغ کی دعوت اڑا کر باہر نکلے تو ان کے ساتھ... وینکٹ ریڈی بھی باہر آیا۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا۔ بال بکھرائے۔ شمال اوڑھے سب نے منع کیا کہ وہ اس بیماری میں باہر نہ آئے مگر... وہ تو نہ کنتھ جانے کو گھوڑی تیار کروا چکا تھا۔ اپنی بھابی اور بچوں کے پرسہ دینے۔ انہیں سہارا دینے۔ ان کی مدد کرنے... نہ کنتھ پہنچتے ہی اس نے سارے گاؤں کو ہلا ڈالا... رنگاریڈی کے بھائیوں اور سالوں کو خوب ڈانٹا۔

ارے تم لوگ کیسے مرد ہو... ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو قاتل ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے۔ فوراً حیدر آباد جاؤ کوئی مشہور وکیل کرو... نہیں تو ٹھہرو... خبردار جو کسی اور... وکیل کو پکڑا... میرا بھائی ملیشم جو اتنا اچھا وکیل ہے۔ آخر کس کام آئے گا! میں تو زمین کا سینہ چیر کے ڈھونڈ لاؤں گا قاتلوں کو... اور پھر وہ رنگاریڈی کی بیوی کے آگے پاؤں پکڑ کے بیٹھ گیا۔

بھابی آپ اپنے آپ کو اکیلا نکو سمجھو۔ میں جب تک دنیا میں ہوں آپ کا نوکر ہوں۔

”یہ بچے میرے بچے ہیں۔“

مستان ریڈی کے پیچھے کھڑا اس کی نقل کر رہا تھا۔ جیسے درد کی شدت سے پاگل سا ہو گیا

ہو۔ وینکٹی جو کہتا وہ بھی اشارے سے وہی کہتا۔

اور آخر وہ اپنی پگڑی کا پلا آنکھوں پر رکھ کر زور زور سے رونے لگا۔

بچارے... کتنے ہمدرد لوگ ہیں۔ نوکر تک اتنا رورہا ہے۔

نہ کنتھ کے لوگ وینکٹ ریڈی کی تعریف کرنے لگے۔

خاموش... اچانک وینکٹ ریڈی مستان کو دیکھ کر غصہ میں چلا یا۔

اے بے حرام زادے تجھے کیا ہوا... اب بتاؤں کیا رونے کا مزہ۔“ وہ پیر سے جو تا نکال کر لپکا مگر لوگوں نے روک دیا۔

جانے دو بھائی، بچارا اپنے ہاتھوں سے رنگاریڈی کی خدمت کر چکا ہے، اس لئے اسے بہت دکھ پہنچا ہے۔

نہیں نہیں کوئی وکیل مت کرو، وینکٹی بھائی... رنگاریڈی کی بیوی سر پیٹ کر رو رہی تھی... میں خود ”...“ ڈھونڈوں کی قاتل کو... میں اس کا خون پی جاؤں گی... او بھگوان یہ تو نے کیا کیا

بھابی ہوش میں آؤ۔ بھائی... تم کاں جائیں گے ڈھونڈنے۔ بچوں کا خیال کرنا...“ وینکٹی منہ سے پسینہ پونچھنے لگا۔

پھر کون ڈھونڈے گا اسے...“ اس نے آنسوؤں سے بھرا چہرا اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔

“ کون پکڑے گا اس مٹھی ملے کو...؟“

اماں... نکو رومیرو اماں“ مستان نے روتی ہوئی بیوہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔



‘ ‘ .....میں ہوں نا”

واپس آتے وقت جب مستان بگھی کے پیچھے کھڑا ہوا تو وینکٹ ریڈی نے پیچھے مڑ کے کہا..... آج تو بہت بک بک کر رہا تھا۔ ٹھہر ، آج تیری سیندھی کا نشہ اُتاروں گا۔

سوجی ہوئی آنکھیں تھکا ہوا بدن لئے مستان گھر آیا تو سارا گھر اُجلا اُجلا سا نظر آیا۔ بیچ آنگن میں موز کے پتوں کا ہر امنڈ وا پڑا تھا۔ اور سارے گھر کو سرخ مٹی سے ابھی ابھی کسی نے لپیا تھا۔ لو... وہ تو بھول ہی گیا... کل خواجہ بی کا منجا تھا۔ اس کی بیوی نے جانے کتنے جوڑ توڑ کے بعد دوسرے گاؤں کا ایک لڑکا ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ وہ بھی کھیت مزدور تھا۔ اپنے گھر لے جا کر نکاح پڑھالے گا۔ چلو ایک بوجھ تو کم ہو گا۔ اس شادی کے لئے پوشما نے دس روپے اور دو پائیلی چاول دیئے تھے۔ رتنانے ساس سے چھپ کر پانچ روپے دیئے اور پھر سارے بڑے گھر والوں نے مل کر دولہا والوں کو کھانا کھلانے کا وعدہ کر لیا تھا۔

اُوجی سیلیو ، ہلدی لگانے

ہلدی لگائیں دیکھو کیسا سہانا

اگے چپ بیٹھ کے ہوئی“..... احمد بی نے گھبرا کے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا.....“تیری جہان کو انگار لگو ”  
 “...ریڈی سن لیا تو جان سے مار دیں گانا۔

ارے جاؤ بھوت دیکھے مارنے والے“..... سلیم نے اماں کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”

ایک تو ان کی خدمت کرنا پھر جوتے کھانا.....پھر وہ حرام کے ہماری عزت بھی لوٹ لئے نا“... غصہ کے مارے ”  
اس کی آواز بھرا گئی اور وہ سر جھکا کر سسکیاں لینے لگا..... مستان نے سر اٹھایا ، احمد بی منہ پھاڑے سلیم کو دیکھ رہی تھی۔

اس چھو کر ے کو کیا کروں گے اماں.....؟“ اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

کل خواجہ منجے بیٹھے گی اور اُنے بڑی بڑی باتاں کررا... کوئی سُن لیا تو اب مستان بھی سر جھکائے سسکیاں لینے لگا۔ ان دونوں کو روتے دیکھ کر چھپر کا بمبو تھا مے خواجہ بی بھی رونے لگی۔ آنسوؤں کے اس سیلاب میں احمد بی ٹوبنے لگی۔ مگر اس گھر کی وہ ہم مانجھی تھی اور ہر بار ڈوبتی ناؤ کو بچانا ، اس کا کام تھا۔ پھر وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر بیٹھ گئی۔

اسی وقت لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے مراد اندر آیا۔ آجکل ریڈی نے اسے جنگل سے لکڑیاں کاٹنے پر لگا دیا تھا..... شام کو وہ گھر آتے وقت تھوڑی سی لکڑیاں چرا کے گھر لے آتا وہ تھا۔ بوجھ آنگن میں پھینک کر وہ پسینہ پونچھتا ہوا اندر آیا اور سر جھکائے سب کو روتے دیکھ کر ٹھنک گیا۔

کیا ہوا.....؟“ اس نے گھبرا کے پوچھا۔ ”

ابھی کچھ نہیں ہوا.....“ مستان پھٹی لنگی سمیٹ کر اٹھا..... باہر جاتے جاتے اس نے جھک کر سلیم کی درانتی ” اُٹھائی اور ریڈی کے گھر کی طرف چلا گیا۔ راستے میں اسے ابو خاں ملا۔ ابو خاں نے بڑے غور سے بڑے بھائی کو دیکھا بچارے کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ ایک منٹ کی فرصت نہیں دیتا ریڈی۔

جانے کونسے پاپ کئے تھے ہم نے کہ اتنا دکھ جھیل رہے ہیں۔

شام کو تھکا ہارا وینکٹ ریڈی گھر آیا تو سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ بیٹھک میں۔

چپے شاہ کی درگاہ کے مجاور صابر میاں، مدن لال، پولیس پٹیل ، اسکول کے ماسٹر صاب معین الدین ، پوچما کے دیول کاپنٹلونارائینا .....اس کے علاوہ تمام گاؤں کے بڑے بوڑھے وہاں آگئے تھے کہ رنگاریڈی کے قتل کا قصہ سنیں۔

!وینکٹی کس کس کو کیا کیا سنا تا

وہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا..... منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

کیا بتاؤں..... بہت بڑا قصہ ہو گیا..... جوان بیٹی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ سنا ہے ایک بچہ ماں کے پیٹ ” میں ہے۔“

ہاتھ میں درانتی لئے مستانِ اندر آیا اور وینکٹی کے پیچھے کھڑا ہو کر باتیں سننے لگا۔۔۔“ تو یہاں کیوں آیا..... جا اندر جا کے اپنا کام کر۔۔۔“ مستان کو یوں سر پر سوار دیکھ کر وینکٹی کو بڑی چڑ آ رہی تھی۔

تم سب بھی جاؤ... یہاں کوئی تماشہ ہو رہا ہے کیا کہ سب دیکھنے کو آگئے ہیں.....“ صابر میاں نے سارے مجمع ” کو بھگانے کے لئے کہا اور پھر جیب میں سے تسبیح نکال کر گھماتے ہوئے بولے۔

تو قاتل پکڑا گیا یا نہیں..... سنا ہے رنگا ریڈی کے بھائی نے قاتل کے لئے پانچ ہزار روپے کا انعام رکھا ہے۔

ابھی کچھ پتہ نہیں چلا کہ مارنے والا کون تھا..... وینکٹی نے آہستہ سے کہا۔ اور ”

سگریٹ سلگانے کے لئے سر جھکایا تھا کہ اچانک مستان کی درانتی کھٹاک سے اس کی گردن پر آپڑی... پھر اس نے زور زور سے اتنی بار درانتی اس کی گردن پر ماری کہ وینکٹی کا سر گردن سے کٹ کر دور اس کے اونچے شاندار دروازے کی دہلیز پر جا پڑا... کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ خون میں نہا گئے۔ یہ سب اتنی جلدی ایک پل میں ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔

‘ ‘ میں بتا تاوں خاتل کون ہے۔ اب پکڑ لیا میں اس کو ”

مستانِ پوری قوت سے چلا رہا تھا..... وہ خون میں بھری درانتی لئے با ہر نگل گیا اور چلا چلا کر لوگوں سے کہنے لگا۔

میں پکڑ لیا نارنگاریڈی کے قاتل کو..... آؤ دیکھو..... دیکھو ”

“قاتل کون ہے۔“

ذرا سی دیر میں سارا کمرہ خالی ہو گیا..... ڈر کے مارے سب بھاگے اپنے اپنے گھر میں..... رتنّا اور پوشما کی چیخیں سارے گاؤں میں گونج رہی تھیں۔ مگر کوئی ان کی مدد کے لئے نہیں آیا۔

ایسا خوفناک قصہ کبھی نہیں سنا تھا..... اپنے گھر کا غلام..... جس پر وینکٹی نے اتنا بھروسہ کیا..... اس کے سارے خاندان کو پالتا تھا بچارا۔ اس نے اپنے مالک کو مار ڈالا۔ یہ سب قیامت کے آثار ہیں..... صابر میاں نے گھر جا کر خون سے بھرے کپڑے بدلنے میں کہا۔ صابر میاں کی درگاہ میں بھی کئی آدمی تھے، ان کے رازدار، شریک کارا گر وہ بھی اسی طرح بدلا لینے پر اتر آئیں تو۔ خوف کے مارے بخار چڑھ گیا۔

آج خواجہ بی منجے بیٹھنے والی تھی۔

اس لئے احمد بی کے ہاں ”بی پری“ کی فاتحہ ہوگی۔

بی پری“ کی فاتحہ بڑے اہتمام سے کی جاتی ہے۔ سات سہاگنیں نہا دھو کر چکی کو اور نئے گھڑوں کو گھیرو سے ” رنگتی ہیں۔ گیارہ گلیوں کو رنگ کر اس میں ہلدی اور تیل بھرتیں۔ ہری بھاجی اور کھچڑی پکا کر گھڑوں پر رکھ دیتیں۔ پھر بیچ میں سرخ پردہ تان دیا جاتا۔ تا کہ مولوی صاب فاتحہ کریں تو اس کھانے پر کسی مرد کی نظر نہ پڑے۔

.....بللہ بللہ..... ہر دم میں بولوں گی

ثنا صفت کے موتی میں گھولوں گی

سامنے کی دہلیز صندل سے لپیائی

آئیں حضرت بی بی صندل پھول بچھائی

فاتحہ کے بعد دلہن کو ہلدی تیل چڑھانے کی رسم شروع کی جاتی ہے۔

ابھی عصر کی اذان نہیں ہوئی تھی۔ بڑی دیر تک احمد بی آنکھ میں کھڑی منڈوے کو دیکھتی رہی ، جو ہوا کے جھونکے سے کانپ رہا تھا۔

آئیں حضرت بی بی صندل پھول بچھاتی۔

وہ گنگنانے لگی۔ کتنے انتظار کے بعد یہ دن آیا۔ احمد بی نے ٹھنڈی سانس لی۔ وینکٹی کی دیوڑھی سے آنے کے بعد تو اسے یقین نہیں تھا کہ اب خواجہ بی کی شادی ہوگی۔ مگر اللہ مہربان ہے۔ وینکٹی کی ماں پوشما نے گڑ بڑ کر کے اپنے میکے والے گاؤں کے ایک مزدور کا پیغام جوڑ دیا۔ پوشما جتنی سخت مزاج تھی اتنی ہی دیا لو بھی تھی۔ اپنے گھر میں کام کرنے والے مزدوروں سے اسے ہمدردی تھی۔ ان کے اچھے بُرے وقت میں پوچھنا، ان کے رشتے جوڑنا ، ان کے لڑائی جھگڑے نبھانا اور وقت بے وقت بیٹھے سے چھپ کر ان کی مدد کرنا بھی جانتی تھی۔ کام بھی کیا تھا۔۔۔ دن بھر اپنے تخت پر لیٹی بہو اور نوکروں کی نگرانی کرتی یا کسی نہ کسی بیماری میں لیٹی ہائے ہائے کئے جاتی تھی اور خواجہ بی کی شادی کی تو اسے بڑی فکر ہو گئی تھی کہ دیوڑھی والے قصے کی بھنگ کان میں پڑ چکی تھی۔ زمانہ خراب آ گیا ہے۔ مستان بچارا تو ہولا شولا آئی ہے۔ مگر اس کے لڑکے اگر شور مچاتے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ! اس کے بیٹے جانے کیسے ندیدے ہیں کہ نیت ہی نہیں بھرتی اُجاڑ صورتوں کی۔ اگر کوئی گڑ بڑ ہوگئی تو پورے گاؤں میں شور اُٹھے گا۔ اور آجکل سرکار تو ویسے ہی ہمارے خلاف بندوقب تانے بیٹھی ہے۔ بات بات پر پولیس کی دوڑ آتی ہے گاؤں میں۔

پوشما کی مہربانی یاد کر کے احمد بی نے سر پر پلو کھینچا۔ اللہ اس کا پیٹ ٹھنڈا رکھو یا پروردگار۔ خواجہ بی تو ابھی سے دلہن کی طرح سر جھکائے اندر بیٹھی تھی۔ آج گاؤں کے سب گھروں میں الا نچی بانٹنا تھی۔ الانچی بانٹنے کی رسم اصل میں شادی کا دعوت نامہ تھی۔ سرخ کاغذ میں الانچی کے دانے شکر کے دانوں کے ساتھ لپیٹ کر ہر گھر کے بزرگ کے ہاتھ میں دیئے جاتے شادی کا یہ دعوت نامہ ایک اعزاز بھی تھا کہ لینے والا برادری کا ایک معزز رکن ہے۔ ورنہ جن کے گھر کوئی لڑکی بھاگ جاتی، کوئی چوری کرتا ، سابوکار سے قرض لے کر بھاگ جاتا، کسی کی عورت بھگالانا تو اس کے ہاں ”الانچی“ نہیں بھیجی جاتی ہے۔ بچارے اپنا منہ لے کر کسی کونے میں بیٹھے رہتے ہیں۔

آج بہت کام تھے۔ مستان ایک دن کی چھٹی لے کر گھر کیوں نہیں آجاتا۔ شاید آج وہ گھوڑا لا نے حیدر آباد جائے گا۔ احمد بی نے سوچا آج مستان سے اپنے لئے چوڑیوں کا جوڑا منگواؤں گی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی ، اس نے حیدر آبادی جوڑے کے خواب دیکھے تھے۔ اور ہر سال مستان وعدہ کرتا تھا کہ چوڑیوں کا جوڑا ضرور لائے گا۔ گھوڑا لانے کے بعد ریڈی .....ضرور مستان کو کچھ انعام دے گا۔ اس نے کتنا بڑا کام کیا نہ نا

اماں تو سنی.....رنگاریڈی کے قتل کا پتہ لگانے والے کو کتے پانچ ہزار روپے ملیں گئے“ سلیم ہاتھ میں ایک پرانا ” اخبار لئے آیا۔

اس کے مرنے کی خبر تو اخبار میں بھی چھپی ہے۔ میرا جو دوست بس ڈرائیور ہے نا انے لایا“ سلیم نے اخبار اماں ” کے سامنے پھیلا دیا

سچی ؟“ احمد بی خوف کے مارے کانپنے لگی۔

اس اخبار کو چھپا دے رے بیٹا..... کیا معلوم کسی کی نیت بھٹک گئی تو“ احمد بی نے گھبرا کے کہا۔۔۔ ”کہتے ہیں ” خون کبھی نہیں چھپتا... اگر نہیں چھپتا تو“ احمد بی گھبرا کے لیٹ گئی

‘ ‘ اماں ، میں نہ کتنے جاتاؤں... قاتل مل گیا تو“

..... مارو..... پکڑو..... مارو..... اچانک باہر شور اٹھا

..... سلیم نے اخبار و ہیں پھینکا ..... باہر کی طرف بھاگا ..... کیا ہوا ..... الہی خیر

احمد بی گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔

مستان نے وینکٹی کو مار ڈالا..... ان کے گھر کے آگے لوگوں کا ہجوم تھا۔

..... کیا..... کیا...؟ نہیں نہیں ..... احمد بی چکرا کے گر پڑی

سارے گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ پھر بہت سے لوگ خون میں شرابور مستان کو پکڑ

کے اندر لاتے اور بھینسوں کے باڑے کئے ڈھکیل دیا۔ وہ جہاں گرا تھا وہیں لیٹ کر بے ہوش ہو گیا ، اور اس کے ہاتھ سے خون میں ڈوبی ہوئی درانتی گر گئی۔ پورا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب پولیس آئے گی۔ پنچ نامہ ہوگا..... اس لئے سب لوگ وہاں سے بھاگنے لگے۔ ذرا دیر میں آنگن خالی ہو گیا۔

میرے باوا یہ کیا کیے جی تم..... ” خواجہ بی، گوری بی ، مالن بی اور سب بچے رورو کر اپنے سروں پر خاک ” ڈال رہے تھے..... سارے گاؤں کے سنائے میں صرف دو گھروں سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں..... وینکٹی کے گھر سے اور مستان کے گھر سے۔

سلیم نے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے تو احمد بی نے آنکھیں کھولیں ، اور دل تھام کر ادھر ادھر دیکھا۔ سب بچے ایک دوسرے کو تھامے چلا رہے تھے۔ آنگن میں وینکٹی کا خون پھیلا ہوا تھا اور مستان یوں بے سدھ پڑا تھا جیسے کسی نے اس کا سر کاٹ دیا ہو۔

کیا ہو گیا آج تمہارے کو..... یہ کیا کہ جی تم“ گوری بی اٹھ کر مستان کے پاس گئی اور اسے جھنجھوڑنے لگی۔ ” مستان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ اپنے خون آلود کپڑے اس نے غور سے دیکھے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر رونے لگا۔ پھر اٹھ کر اپنے بھائی ابو خاں سے لپٹ گیا۔

‘..... میں..... میں کچھ نہیں کیا..... وہ..... وہ میرے سامنے کیوں بولا.....؟ کیوں بولا..... تو بول نا ابو‘

ہو باوا..... تیرا کیا قصور ہے۔ انے تجھے جوتے سے مارا ہوں گا۔“ سلیم باوا سے چمٹ کر رونے لگا۔ پھر الگ ہوا ” تو وینکٹی کا خون اس کے بدن کو بھی لگ چکا تھا۔

نہیں..... نہیں.....“ مستان کی سانس پھول رہی تھی... وہ بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ ”

..... وہ مجھے ہزار جوتے مارتا..... پن انے میرے سامنے کیوں بولا

وہ پھر درانتی لے کر یوں اٹھا جیسے ابھی وینکٹی کو اس نے جی بھر کے سزا نہ دی ہو..... احمد بی سب بچوں کو لے کر دور ہٹ گئی..... وہ جانتی تھی اس وقت اس پر

خون سوار ہے۔ اس لئے اس نے سلیم کو پکڑ کے اندر ڈھکیل دیا۔ مگر سلیم پھر باہر آیا۔ اور اس کے ہاتھ سے درانتی لے کر جو..... باپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا

تو نکو ڈر باوا..... اچھا کیا اس کو مار ڈالا۔ لا اب یہ درانتی میرے کو دیدے.....“ اچھا کیا نا.....؟ مستان آنگن ” میں کھڑا لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔ جیسے وہ خوب نشے میں ہو۔

دیکھو نا..... انے میرے سامنے کیوں بولا ؟“ میں کیا کروں...؟“ مستان پھر ”

زمین پر بیٹھ کر رونے لگا۔ اب سلیم، احمد بی اور سب بچے مل کر اتنی زور زور سے رور رہے تھے کہ پوچھا کے مندر میں پوجا کرنے والے بابر آ کر گاؤں کی طرف دیکھنے لگے۔ اور آس پاس کے درختوں پر بیٹھے کووں نے شور مچانا شروع کیا..... آنگن میں پڑے ہوئے منڈ وے کو لوگوں نے پیروں سے روند کر گرا دیا تھا۔ گیرو سے لپی ہوئی گیارہ کلیوں کی بلدی گر کے سارے گھر میں بکھر گئی تھی۔

سرخ مٹی سے لیے ہوئے آنگن میں وینکٹی کے خون کے چھینٹے صاف نظر آ رہے تھے۔

مراد کسی جنگل میں لکڑیاں پھوڑ رہا تھا۔ اس نے یہ خبر سنی تو بھاگا بھاگا گھر آیا۔ مگر پولیس آچکی تھی۔ اس سے پہلے کہ مراد بھی باپ کے گلے لگ کر روتا، پولیس والوں نے سب کو ہٹا کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

پولیس کو دیکھ کر گھر میں پھر کھرام مچ گیا۔ بچے سر پیٹ پیٹ کر رونے لگے۔

غم کے مارے احمد بی نے دیوار پر مار کے اپنا سر پھوڑ لیا۔ مراد اور سلیم چھاتی پیٹ پیٹ

کر رونے لگے۔

نکو..... میرے کو کو پکڑو....“ مستان چلا چلا کر ہاتھ چھڑانے لگا۔ ”

‘ ‘... قصور اس کا ہے۔ میری بات سنو آپ سرکار۔ اُنے میرے سامنے کیوں بولا“

ہو، سب معلوم ہے قصور کس کا ہے۔ اب پھانسی کے تختے پر چڑھ کر بتا دینا۔ پولیس انسپکٹر نے اسے باہر کی طرف دھکیل دیا۔

.....ارے جاؤ جاؤ ، میرے کو ڈر بتائیں کیا۔ میرے سات بیٹے ہیں

سلیم..... سلیم..... سہ..... سہ....“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر سلیم کی طرف دوڑا۔

چپ سالے..... ایک کانستبل نے مستان کے سینہ پر لات ماری اور جیپ

اسٹارٹ کر دی۔

جب انسپکٹر مستان کو ڈھکیل کر باہر لے جا رہا تھا تو اس کے پیروں کے نیچے وہ اخبار الجھ کر پھٹ گیا۔ جس میں رنگاریڈی کے قاتل کو پکڑنے کے لئے پانچ ہزار روپے کا انعام تھا۔

.....باوا..... میرے باوا..... میں آراوں..... تم پریشان نکو ہونا“

‘ ‘.....میں جو ہوں

سلیم جیپ کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا..... بھاگتا گیا..... اور آخر

.....تھک کر دھول بھری سڑک پر گر پڑا

دو چار دن بعد احمد بی سب بچوں کو لے کر مراد کے ساتھ وینکٹی کے گھر گئی مگر سلیم کسی طرح ان کے ساتھ جانے راضی نہ ہوا۔ حالانکہ گاؤں کے سب بڑے بوڑھوں نے کہا کہ احمد بی کو جا کر پوشما اور رتنّا کے قدموں پر گرنا چاہیے۔ باپ کے کیے کی سزا بچے کیسے بھگتیں گے۔ اور اگر پوشما نے انہیں معاف نہ کیا تو وہ سب جیتے جی مرجائیں گے۔

بیٹے کے غم میں روتے روتے پوشما بیمار برنگی تھی۔ احمد بی اور اس کے بچوں کی آواز سن

.....کر اس نے منہ پھیر لیا

میرے سامنے مت لاؤ اس قاتل کی اولاد کو..... سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے..... اب ان چھوکروں کو گھر میں ”  
‘ ‘ ،..... مت آنے دو

..... مگر روتی ہوئی رتنّا نے آنسو پونچھ کر احمد بی سے پوچھا

سلیم نہیں آیا.....؟ انیں گا.....؟ انیں گا میری اماں ! تو اسے معاف کر دے۔ میرے بچوں پر دیا کر... تیرے پاؤں ”  
”بڑتی ہوں۔“

احمد بی سچ مچ رتنّا کے پیروں پر گئی..... سفید ساری میں لپٹی ، سونی کلانیاں، اُجڑی مانگ۔ کسی میں ہمت نہ تھی  
کہ رتنّا کو جی بھر کے دیکھ سکے۔

ملیشم اندر آیا تو اس نے اتنے بہت سے بچوں کی قطار دیکھی۔ تین جوان بچیاں بھی بیٹھی تھیں اور مراد کی بیوی نورآ  
بھی تھی ، ان غریب لوگوں میں اپنی خوبصورت عورتیں بھی ہیں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اور جب احمد بی اپنے سب بچوں  
سمیت ملیشَم کے پیروں پر گری تو اس نے

بیچھے کی طرف ہٹ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ سب چھوکروں کو کھیتوں پر کام کرنا ہوگا اور جب یہ چھو کر یوں کو کام پر بلانے تو بھیج دینا۔“

.....اچھا.....اچھا.....”احمد بی دوڑتی ہوئی گھر آئی“

”سلیم.....اگے او سلیم... جلدی جاتیرے کورتنّا بلاری۔“

.....نہیں.....ہر گز نہیں“ سلیم نے غصہ میں کہا“

میں اپنے باپ کے قاتل کے گھر جاؤں۔ میں تو ان کا گھر جلا ڈالوں گا۔ ان لوگوں“

نے میرے باپ کو پھانسی پر چڑھایا۔ آخ تھو ہے ، ان کی صورتوں پر“ وہ زور زور سے چلانے لگا تو ابو خاں نے اٹھ کر اس کے  
منہ پر تھپڑ مارے۔

‘ ‘ ،.....اتے بڑے ساہوکار کو جان سے مارڈالے اور بڑی بڑی باتاں کر را۔ کیا تو بھی پھانسی پر چڑھنے والا ہے“

ہنو.....میں پھانسی پر چڑھوں گا۔ مگر اپنے باپ کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا.....” سلیم سنے پر ہاتھ مار کے ”  
بولا۔ پھر مراد نے کونے میں رکھی لاٹھی اٹھائی اور اسے مارنے دوڑا... سلیم سارے گھر میں چھپتا پھرا۔ آخر چولھے کئے  
..... مراد نے اسے پکڑ لیا اور اس کی پیٹھ پر تابڑ توڑ لاٹھیاں برسائیں

دونوں بھائیوں کی لڑائی پر احمد بی رونے لگی۔ بچے چلانے لگے۔ مگر مراد نے لاٹھی کسی کو نہیں دی۔

اتنا بڑا چھوکرا ہو گیا۔ کام کا نہ دھام کا ، سارا دن کھیتوں میں اچھل کود کرے گا یا پھر رتنّا کے گھر میں گھسارے گا۔  
اور اب سارے گھر کو مارنے کی فکر کر رہا ہے۔ بھلا کہیں آج تک کسی نے خون معاف کیا ہے! یہ بچارا ملیشَم اتنا اچھا آدمی  
ہے کہ بھائی کے قاتل کے بچوں کو گھر میں گھسنے دیا۔ کام دینے کا وعدہ کیا۔ کوئی اور ہوتا تو سب کو جان سے مار ڈالتا  
.....مراد، سلیم کو مار کے خود تھک گیا۔ نورآ نے شوہر کو اتنا غصہ میں دیکھا تو پاس بیٹھ کر کمر دبانے لگی۔ نورآ اس گھر  
کی سب سے خاموش رہنے والی عورت تھی..... گھر میں کچھ ہو جائے ، وہ چپ چاپ کسی کونے میں بیٹھی بچے کو دودھ  
پلانے جاتی تھی۔ گھر کو لیپنا، پانی لانا، پکانا، کپڑے دھونا ، سب اس



کے ذمہ تھا۔ کیونکہ احمد بی اسے مزدوری پر نہیں بھیجتی تھی۔ گھر کی بہو لچھمی ہوتی ہے، چاہے گھر والوں پر کتنے ہی فاقے گزریں۔ بچے سارا دن محنت کریں، مگر بہو کو باہر کیسے بھیج سکتے ہیں۔ اور وہ بھی اتنی گوری چمکتی ہوئی بہو کو تو چھپا کر ہی رکھنا چاہیئے کہ اس پر جس کی نظر پڑتی ہے۔ پھر کچھ اور نظر نہیں آتا۔

سلیم کے منہ میں خون نکلنے لگا۔ اس کی پیٹھ پر خراشیں پڑ گئیں۔ مگر اس سے سارے ہمدردی کرنے والے ہاتھ..... جھٹک دیئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر سر جھکائے بیٹھا رہاوار خون تھوکتارہا

صبح سویرے اسکول جاؤ، پھر کھیت کا کام کرو۔ ریڈی کی بکریاں چرانے جنگل جاؤ۔ اس کی لکڑیاں چیرو..... آم اور املی توڑنے کی مزدوری کرو..... مراد کی چرائی ہوئی لکڑیاں دوسرے گاؤں لے جا کر بیچو..... اور پھر بھی سب یہی کہتے ہیں کہ وہ کچھ کام نہیں کرتا..... اس کا بھائی تو اس فکر میں ہے کہ بہنوں کی شادی کے لئے اسے بھی ساہوکار کے..... ہاں پانچ سو روپے میں رہن رکھ دے۔ مگر میں تو کسی کی غلامی نہیں کروں گا

.....سالے آدمی کو پھانسی پر چڑھا دیتے ہیں۔ چاہے سب بہنیں کنواری بیٹھی رہیں

پھر وہ سوچ کر جلدی سے اٹھا..... باوانے جس درانتی سے وینکٹی کو کاٹا تھا وہ اماں نے اپنے ٹوٹے صندوق میں چھپا دی تھی۔ اس نے کوٹھری میں گھس کر سارا گوڈ رکھسوٹ دالا اور پھر درانتی نکال کر باہر آیا۔

.....درانتی مجھے دے“ مراد نہ پیچھے سے آکر اسے پکڑ لیا“

اس سے کیا کاٹنا کیا نہیں کاٹنا، یہ بچوں کو نہیں معلوم ہوتا..... جا۔ باہر جا کر ”

کھیل“ اس بار مراد کے لیجے میں اتنا رعب تھا کہ سلیم کچھ نہ کہہ سکا۔

در انتی اس کے ہاتھ سے چلی گئی تو وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا..... اب

کونسا کھیل کھیلوں.....؟

مستان کا پاگل پن گاؤں کا بہت بڑا حادثہ تھا۔

وینکٹی کو قتل کرنا اتنی معمولی سی بات نہیں تھی۔ ملیشم وکیل تھا۔ اس نے چیکٹ پلی سے لے کر حیدر آباد تک شور مچادیا تھا۔ سارے گاؤں کے معزز لوگ اکھٹے ہوئے اور ملیشم کی اس بات کو مان لیا کہ وینکٹی کا قتل دراصل اتحاد المسلمین کی ایک سازش ہے جس کے پیچھے نواب دلاور علی خاں کا ہاتھ کام کر رہا تھا، ورنہ ایک کھیت مزدور کی یہ جرات ہو سکتی ہے کہ بیس برس سے جس کا نمک کھایا اسے منٹ بھر میں ختم کر ڈالے؟

اب وقت آگیا ہے کہ گاؤں کے سارے ہندو و سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ ان مسلمان غنڈوں کو کیسے کچلا جائے۔ بہت سہ لے نظام کی دھونس، اب تو کانگریس کا راج ہونے والا ہے۔ ملیشم گاؤں والوں کو اکٹھا کر کے ہر روز ایک بھاشن دینے لگا۔

اس واقعہ کے بعد گاؤں کے سارے کسانوں پر سخت نگرانی رکھی جانی لگی۔ سارے کھیت مزدوروں کو حکم دیا گیا کہ وہ گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ مراد علی خاں، چھوٹے نواب، ملیشم اور سارے جاگیر داروں، دیشمکھوں کی موٹریں بار بار گاؤں آنے لگیں۔ سب الگ الگ کانا پھوسی کرتے۔

اب چند دن بعد لال قلعے پر ترنگا لہرانے والا تھا۔ اس لئے اعلیٰ حضرت کی نیاڈانو ڈول ہو رہی تھی۔ اتحاد المسلمین کے جلسوں میں شرکت کرنے گاؤں گاؤں سے لوگ جاتے تھے اور جوش میں بھرے ہوئے واپس آئے۔ انہیں اچانک اسلام خطرے میں نظر آنے لگا تھا۔ اعلیٰ حضرت سے شدید وفاداری کا احساس پیدا ہو گیا۔ مسلمان لڑکوں کو رضا کا رہنانے کے لئے شہر سے

لوگ گاؤں گاؤں پھرنے لگے۔ فوج کی وردی پہنے چھوٹے چھوٹے بچے نماز کے بعد مسجدوں کے سامنے پریڈ کرنا سیکھتے۔ لٹھ بازی اور نشانہ بازی کی مشق ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر ہندو گھرانوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ سوامی رامانند تیرتھ نے حیدر آباد میں بڑی زور دار تقریریں کرنا شروع کر دی تھیں... اب کیا ہو گا! سب مل کر بیٹھتے تو یہی باتیں ہوتیں۔

صابر میاں چپے شاہ کی درگاہ کے مجاور تھے۔ اس لئے اچانک ان کی اہمیت بڑھنے لگی۔ وہ چیکٹ پلی میں اتحاد المسلمین کے صدر بن گئے اور حیدرآباد میں لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوائیں۔ سب مل کر نواب دلاور علی خاں کے پاس گئے تو انہوں نے اپنے کھیتوں کے پاس والی ایک زمین کا ٹکڑا مسجد کے لئے دے دیا۔ اس زمین کا ایک زمانے سے جھگڑا چل رہا تھا۔

چنو نواب کہتے تھے یہ ان کے پر نانا کی ہے۔ اور دلاور علی خاں کہتے، میرے دادا کی ہے۔ لیکن مسجد کے نام پر سب چپ ہو گئے۔ گھر گھر سے چار چار آنے چندہ جمع ہونے لگا۔ لڑکے لڑکیاں سارے گاؤں سے مٹی پتھر ڈھو کر لاتے۔ ہندو بچے بھی ان میں شامل تھے کہ مسجد بنانا تو ایک ثواب کا کام ٹھیرا۔ جنگلوں سے لکڑیاں توڑ کر اکٹھی کی جانے لگیں۔ صبح اپنے کھیتوں کی طرف نکلتے تو ملیشم اور کشٹیا تیوری پر بل ڈال کر مسجد کے سامان کو دیکھتے۔ پھر کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔

ایک صبح سویرے مولوی صاحب لوٹا لئے کھیتوں کی طرف جارہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ مسجد کی کھدی ہوئی بنیاد میں کوئی سرخ چیز پڑی ہے۔ ابھی صبح کا دھندلکا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ اس لئے انہوں نے جھک کر اسے اٹھایا اور غور سے دیکھا۔ وہ سیندور میں رنگی ہوئی ایک چھوٹی سے ٹوٹی پھوٹی لکشمی کی مورتی تھی۔

انہوں نے ڈر کے مارے جلدی سے مورتی کو وہیں رکھ دیا۔

اجی حضت یہ کیا کر رہیں آپ...“ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر مولوی صاب پلٹے تو ان کے سامنے ملیر کا ”کھڑا تھا۔ ملیگّا کھڑا تھا ملیگّا وینکٹی کا کارندہ تھا۔ مگر سارے گاؤں کا خدائی فوجدار۔ کہیں لڑائی جھگڑا ہوا سے مارنے مرنے سے کام۔ پورا گاؤں اس سے ڈرتا تھا۔ مولوی صاب سارے گاؤں سے بڑی محبت کے ساتھ بات کرتے تھے کہ سب کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری اللہ میاں نے انہیں سونپ دی تھی۔ اس گاؤں کے سب بچوں، بڑوں کو انہوں نے ہی نماز، روزہ سکھایا تھا۔ کبھی جھوٹ نہ بولتے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے۔ اس لئے بچارے اپنے ٹوٹے چھڑ تلے پڑے کھانسنے جاتے تھے۔

... تم وہاں کیا پھینک دینے مولوی صاب.....“ ملیگّا نے ہنس کر پوچھا

کیا ہے کی ملی۔ تو ذرا دیکھ مجھے اندھیرے میں نظر نہیں آتا۔ مولوی صاحب نے گھبرا کے کہا۔

ملیگائے جھک کر مورتی اٹھائی اور اُجالے کی طرف منہ کر کے زور سے چلا یا۔

”ایو دیوڑا..... یہ تو مہا لکشمی کی گڑی ہے۔ دھرتی چیر کے باہر آئی۔ شاید یہ اس کا استہان ہے۔“

”سچی.....“ مولوی صاب گھبرا گئے ”تو جا کر پنتلو کو بول“ مولوی صاب کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ”بڑے کمزور عقیدے والے تھے انہیں جس طرح مرشدوں کی کرامتوں پر یقین تھا، اسی طرح لارڈ وینکٹیشو را اور پوجمّا کے قہر سے بھی ڈرتے تھے۔ بیبت کے مارے آج اذان دیتے وقت ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ صبح جب یہ خبر عام ہوئی کہ مسجد کی بنیاد میں سے لکشمی کی گڑی نکلی ہے تو سارے گاؤں میں تہلکہ مچ گیا۔ مگر صابر میاں اڑ گئے کہ یہ کسی ہندو کی شرارت ہے۔ بھلا جو زمین سات پشتوں سے مسلمان جاگیرداروں کی ہو وہاں دیول کیسے بنا ہوگا! ادھر ملیشمن نے گاؤں کے ہر ہندو کو اپنی ماں سے سنی ہوئی یہ کہانی سناڈالی کہ اس جگہ تو لکشمی کا دیول تھا۔ اب اگر وہاں مسجد بنی تو ہندو اپنی جان کی بازی لگادیں گے۔ لہذا جان کی بازی لگادی گئی۔ صابر میاں کے سکھائے ہوئے لڑکوں نے راتوں رات وہاں چبوترا بنا کر غوث الاعظم کا ہرا جھنڈا لہرایا..... ملیگّا نے دیکھا تو لات مار کے جھنڈا گرا دیا۔ بس پھر کیا تھا، ملیشمن کے سکھائے ہوئے لوگ آگے بڑھے۔ ادھر مسلمان چھو کرے بھی قاسم رضوی کی تقریریں سن سن کر جوش میں بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے آج انہیں کافروں کو مزہ چکھانے کا موقع مل گیا۔ خوب مارم پیٹی ہوئی۔ سب سے زیادہ زخم سلیم کے لگے۔ اس کی پیٹھ پر سے خون نکلنے لگا۔ قمیص خون سے بھیگ گئی۔ وہ خون میں نہایا گھر آیا تو احمد بی اور بہن بھائی اسے دیکھ کر رونے لگے۔ مراد نے بھی خوب گالیاں دیں۔

اماں یہ پوٹٹا ہمیں جینے نہیں دے گا۔ آج تک کوئی گاؤں میں ہندوؤں سے لڑا تھا۔

”ان سے ہماری کیا دشمنی ہے جی؟ اماں، اسے تونانی کے گاؤں بھیج دے۔ میں اس کے لڑائی جھگڑے نہیں چکا سکتا۔

تم کیا بھیجتے..... میں خود شہر کو جاروں۔ کون رہے گا اس اجاڑ گاؤں میں“ وہ اپنے زخموں پر چونے کا لیپ ” کرتے میں بڑبڑا رہا تھا۔

’ کیا...؟ تو شہر جائے گا؟ کیا دماغ پھر گیا ہے تیرا..... ملیشمن کی مزدوری کون کرے گا؟“

’ تو کر“ سلیم نے چلا کر کہا۔ ”کیا باوا کے بدلے سارا خاندان ان کی غلامی کرنا عمر بھر؟“

ابے چپ۔ تیری ماں کی...“ مراد سے تعجب سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بڑی

بے بسی سے اماں کی طرف دیکھا۔

اماں اسے کیا ہو گیا ہے! دیکھائیں پرسوں نرسیا کا حشر..... کیا تو بھی منہ کالا کر کے گدھے کی سواری کرنا ” چاہتا ہے.....؟“ مراد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خود سر لونڈے کو کیسے سمجھاتے۔

بھوت دیکھے منہ کالا کرنے والے۔ کون آئیں گے یاں جو منہ کالا ہوگا۔ وقار آباد کا بس ڈلیور بولا کتے، شہر میں لاری ” کے کلینر کو ۵۲ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ کھانا الگ میں ہر مہینے اماں کو پندرہ روپے بھیج دیا کروں گا۔“ وہ خون دیوار پر تھوک کر بولا۔

پندرہ روپے.....؟ ہر مہینے.....؟“ اماں تعجب سے منہ کھولے

اسے دیکھنے لگی۔

اور یہاں تیرا کام کون کرے گا..... ملیشمن تو مجھے مار ڈالے گا۔ انے پہلے ہی بول دیا تھا کہ اب سارے خاندان کو ” ہمارے کھیتوں پر کام کرنے کو آنا ہے۔“

”تم لوگ بھی کا ہے کو مرتے یاں...آپن سوب مل کر شہر کو بھاگ جائیں گے۔“

کیا..... ہم لوگ گاؤں چھوڑ کر گھاگ جائیں.....؟“ گھانس کاٹتے کاٹتے ”

مراد کے ہاتھ رُک گئے۔

آگے چپ بیٹھ گئے پوٹتے “ احمد بی نے ماتھا پیٹ لیا، کوئی سُن لیا تو سب مارے ”

جائیں گے۔ اُجاڑ صورت کو بھوت مار لگی ہے۔ خون ابھی تک بہہ رہا ہے۔ اسی لئے جل کر شہر بھاگنے کی باتیں کر رہا ہے... مراد نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور مڑ کر اپنی بیوی نوراً سے بولا۔

“نرا جلدی سے تھوڑی مٹی چھان کر لا۔ سلیم کا خون نہیں رک رہا ہے۔ ”

شہر کے لوگوں کے زخموں پر مٹی لگ جائے تو زہر پھیل جاتا تھا۔ مگر کسان کا پودا زمین سے اٹھتا ہے۔ زمین میں مل جاتا ہے۔ اس لئے ان کے زخم بھی مٹی بھرنے سے ہی سوکھ جاتے ہیں۔ مگر سلیم کو آج بڑی گہری چوٹ لگی تھی۔ مسلمان لڑکوں کو مارنے کی خبر حیدر آباد تک پہنچی اور اتحاد المسلمین کے کچھ ور کر دوڑے ہوئے آئے۔

بھائیو... ! سلطنت آصفیہ کے زیر سایہ مسلمانوں پر اتنا ظلم ڈھایا جارہا ہے۔ اب ان کا فروں کی اتنی ہمت ہوگئی کہ ہمارے معصوم بچوں پر ہاتھ اٹھا نیں۔

مسلمانو!..... تمہاری غیرت کو کیا ہوا ہے... ! جو ہاتھ تمہاری طرف بڑھے اسے توڑ دو..... نعرۂ تکبیر..... اللہ ” ، ، اکبر

اور ان نعروں کی آوازوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے رونے چلانے کی آوازیں آس پاس کے گاؤں تک پہنچیں۔ چیکٹ پلی سے اٹھتا ہوا دُھواں چار گاؤں دور سے نظر آ رہا تھا۔

آج رات مسلمان گاؤں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ جیسے ہی یہ خبر گاؤں میں پھیلی، سیٹھ سابوکار اپنے گھروں میں بندوبست کر بیٹھ گئے۔ مگر رنگاریڈی بہت گھبراہٹ... اس کی دو جوان بیٹیاں اور بہو گھر میں تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور سیروں سونا زمین میں گڑا ہوا تھا۔ اس لئے اس نے شہر سے ایک لاری منگوائی۔ جمع جتھا سمیٹا اور بال بچوں کو لے کر اپنے بھائی کے ہاں نلگنڈہ چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے گھر کی چابیاں ابو خاں کے حوالے کیں۔ ابو خاں مراد کا چچا تھا اور مراد ہی کی طرح رنگاریڈی کے ہاں دو پشتوں سے رہن تھا۔ اب تو وہ صرف ایک ہی بات جانتا تھا کہ رنگا ریڈی اس کا آقا ہے۔ اُن داتا ہے رنگا ریڈی ہی کی مہربانی سے اس کے بال بچے زندہ تھے۔ وہ خوب رویا۔ مگر رنگا ریڈی نے اسے محبت سے سمجھایا۔

باڑے میں گائے، بھینس، بیل اور مرغیاں تھیں۔ اور اندر کوٹھری میں وینکٹیشو را کی مورت رکھی تھی، جس کے آگے رنگاریڈی کی ماں روز شام ڈھلے دیا جلایا کرتی تھی۔ اب یہ سب کام ابو خاں کو کرنا تھا۔ اس لئے ابو خاں اپنے بڑے لڑکے اور بھائی کو بھی لے آیا۔ لاٹھیاں

سربانے رکھ کر وہ لوگ سونے لگے۔ اب اس گھر کو سنبھالنے کی ذمہ داری اس پر تھی جہاں اس کے باپ دادا کی عزت رہن رکھی گئی تھی۔ اس کی دادی ، ماں اور بیوی کے گہنے پانے رنگا ریڈی کی تجوری ہی میں رکھے ہوں گے۔ اس کے کھیتوں اور گھر کے رہن والے کاغذ اسی کے صندوقوں میں بند ہیں۔

ابو اس گھر کی حفاظت پر نل گیا۔ اس کا بیٹا اور بھائی لاٹھیاں سنبھالے اس گھر پر حملہ کرنے والے مسلمانوں کے ہاتھوں کو روکتے رہے۔ پھر مسلمان غنڈوں نے ہندو سابوکاروں کے گھروں سے سامان لا کر گھروں کے آگے ڈالا اور آگ لگادی۔ جب وہ رنگا ریڈی کے ہاں اندر گھس کے لوہے کے صندوق اٹھانے لگے تو ابو صندوق پکڑے لٹک گیا..... “نکونکو... یہ صندوق نکو جلاؤ تمہارے پاؤں پڑتاوں۔

ڈال دو اس سالے کو بھی آگ میں...“ کسی نے کمر پکڑ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ابو کو بھی ڈھکیل دیا۔

بچاؤ... میرا بیٹا... میرا بیٹا...“ ابو کی ماں چھاتی پیٹ کر چلا رہی تھی۔ مگر گاؤں کا کوئی آدمی ان شہر کے غنڈوں ” سے مقابلہ کرنے نہیں آیا۔

ابو... ابو... ابو کی ماں خود بھی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑی۔ صبح رنگاریڈی کے گھر کے آگے لوگوں نے بہت کوشش کی کہ ابو اور اس کی ماں کی ہڈیاں الگ الگ پہچان سکیں مگر وہ دونوں جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ ابو اور اس کی ماں کا جلا ہوا بدن نہ ملا ورنہ ان بے وقوفوں کی نماز جنازہ میں کون شریک ہوتا ” جو ایک ہندو کا گھر بچانے کے لئے خود جل مرے۔

مولانا احقر شاہ صاحب نے کہا جو اتحاد المسلمین کے سرگرم رکن تھے اور شہر سے مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کرنے آتے تھے۔ جاتے جاتے انہوں نے پورے گاؤں والوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور کفار سے گن گن کر بدلا لیا جائے گا۔

انشاء اللہ۔

یہ چیکٹ پلی کا پہلا فساد تھا اس لئے سارے گاؤں کے لوگ سہم گئے۔ کیسا قیامت کا وقت آگیا کہ اماں کبھی نہیں سنے تھے ہندو مسلمان لڑتے بول کے۔ کتے مسلماناں دیول جلا دیئے توبہ توبہ..... کتا پاپ لگیں گا..... ان کو

دوسرے دن کے ’ رہبر دکن ’ اور ’ صحیفہ ’ میں ایک چھوٹی سی خبر تھی کہ

وقار آباد کے ایک موضع میں ہندو مسلمان فساد۔ ایک ماں بیٹے کو زندہ جلا دیا گیا.....“ یہ سب دلاور علی خاں کا ” کیا دھرا ہے۔ ملیشمن چیختا پھر رہا تھا۔ میں اس کا مزہ چکھاؤں گا..... حرام زادے..... اب دہلی پر ترنگا جھنڈا لہرانے والا ہے۔ ان سالے مسلمانوں کو جوتے تلے مسل کر پھینک دوں گا..... اپنے کھیتوں کے بیج کھڑے ہو کر ملیشمن خوب دھاڑا..... سب بڑے بوڑھوں نے اسے سمجھایا۔

چپ رہو..... یہ رضا کاروں کا زمانہ ہے۔ کہیں ہمیں جان سے نہ مار ڈالیں سنا ہے نلگنڈہ میں فوج اور رضا کارمل ” کر بہت لوٹ مچا رہے ہیں۔ کمیونسٹوں نے بڑا شور مچایا ہے نظام کے خلاف..... اب تو گاؤں گاؤں عدالتوں سے وکیل آرہے ہیں۔ سب کسانوں مزدوروں کے ساتھ انصاف ہونے والا ہے

اس خبر سے سب ہی گھبرا گئے۔ صابر میاں ، دلاور علی خان، چنو نواب، ملیشمن، رنگاریڈی اور گاؤں کے سارے نواب، گنبدی ، ساہوکار، دیشمکھ سب میں کھلبلی مچ گئی۔ ارے نلگنڈہ پر تو پہلے ہی یہ غنڈے قبضہ کئے بیٹھے ہیں۔ جانے ہمارے گاؤں میں کیا ہو۔

ادھر ابو کا بھائی یوسف سارے گاؤں میں چلا تا پھر رہا تھا۔

میرا بھائی..... میری اماں..... رسالے جلا کر جلے گئے..... ان سب کو ختم کر ڈالوں گا۔ وہ چیخ چیخ کر بے ہوش ہو جاتا۔ ہوش میں آتا پھر سر دیواروں سے پکنے لگتا تھا۔ سارے پاس پڑوسی ، عزیز رشتے دار پریشان تھے۔ مراد اور سلیم اسے تھامے بیٹھے تھے۔ مگر وہ چھوٹ چھوٹ کر بھاگتا۔

کیسے بُرے دن آگئے رے اللہ میاں۔ کبھی نہیں سنی تھیں وہ باتاں ہونے لگیں ” احمد بی سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

مستان کے مقدمے کی اگلے مہینے پیشی تھی اور سلیم کہتا تھا اسے پھانسی کی سزا

ہوگی..... یہ سن کر احمد بی کے ساتھ سب بچے چلا چلا کر روتے تھے۔

صابر کا بھائی چاروں طرف چیختا پھرا۔ جب تک سارے گاؤں کو آگ نہیں لگا دوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا..... وہ گاؤں سے باہر چلا گیا..... ضلع کی عدالتوں کے چکر لگاتے بہ حیدر آباد تک گیا۔ بڑے لوگوں کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرا اور پھر غائب ہو گیا۔ لوگ کہتے تھے وہ دلم (چھاپہ مارہ ستے) میں جاملے ہے۔

ان خبروں سے کنگ کوٹھی پر دہشت طاری تھی۔ اعلیٰ حضرت سے یہ خبر میں چھپائی جاتی تھیں۔ پھر بھی وہ غصہ..... میں چلا تے..... پکڑ کے لاؤ بد معاشوں کو

سب کو کڑی سزائیں دو..... مگر اب جھونپڑیوں میں کیا رکھا تھا۔ باغی لڑکے تو ہاتھوں میں بندوقیں تھام کر جنگوں اور پہاڑوں پر گھوم رہے تھے..... ادھر حکومت کے صوبے دار اور تحصیلدار گاؤں بھیجے جاتے تھے تو وہ اچھی اچھی مرغیوں اور لڑکیوں کو چھانتے کے سوا اور کچھ نہ کرتے۔ گاؤں سے جاتے وقت ان کے ساتھ خالص گھی کے ڈبے، مرغیوں اور انڈوں کے جھانپے، موز اور گنے کے ٹوکڑے سمیٹنے کی وحشت سوار ہوتی تھی۔ پھر حکومت کا ایک اعلان ہوا کہ سارے تحصیلدار اور تعلقدار اپنے مستقر پر ٹھہرے رہیں اور کسانوں کی بغاوت کو سختی سے کچل دیا جائے۔

اب گاؤں کی لڑکیوں اور بہو بیٹیوں کی شامت تھی کہ راتوں کو شراب پینے کے بعد ان تحصیلداروں کو عورت کے بغیر نیند نہ آتی تھی۔ اس لئے گاؤں کے پولیس پٹیل اور تحصیل کے چیراسی آدمی رات کو چھاتی سے لیٹے ہوئے بچوں کو چھڑا کے ماؤں کو پکڑ کے لے جاتے تھے۔

ایک رات تحصیل کا چیراسی مراد کے پڑوسی نرسیا کے گھر پہنچا۔ نرسیا مراد کا پکیار تھا۔ بچپن سے دونوں ساتھ کھیلے۔ ساتھ بڑے ہوئے۔ دونوں نے اسکول میں ساتھ ساتھ آٹھ کلاسیں پڑھیں تھیں۔ اور اس طرح وہ دونوں اپنے اپنے خاندان کے واحد چشم و چراغ تھے جنہوں نے اپنے علم کا جھنڈا خاندان میں بلند کیا تھا۔

نرسیا کے بڑے بھائی رامیا کی شادی ابھی مہینہ بھر پہلے ہوئی تھی۔

آج صبح جب تحصیلدار صاب ملیشم کے ساتھ صبح تفریح کرنے نکلے تو انہوں نے ایک بہت صحت مند سانولی سلونی ہنس مکھ لڑکی کو چارے کا گھٹا سر پر لے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر تحصیلدار صاحب کو جوش کی وہ نظم یاد آگئی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ایسی تگڑی

محبوبہ کو چھو تو انگلیوں کے چھل جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ شیروانی پر ٹپک جانے والی پیک کو پو نہجہ کر انہوں نے ملیشم سے کہہ دیا کہ انہیں اپنی انگلیاں زخمی کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی ملیشم نے اپنے تمام کارندوں کو بلا کر کہہ دیا کہ آج وہ لڑکی نہ ملی تو ان سب کی خیر نہیں ہے۔ ابھی رات کے دس بھی نہ بجے تھے کہ ملیگا رامیا کے دروازے پر پہنچا... تحصیلداروں، تعلقداروں اور جاگیرداروں کو کوئی عورت پسند آجائے تو گاؤں والوں کا فرض تھا کہ چپکے سے اسے حوالے کر دیں۔ اس بات کی خبر کانوں کان کسی کو نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ اس گھر کے مردوں کا سر اور ساہوکار کی جوتی۔ مگر اتفاق سے نرسیا آنگن میں چراغ سامنے رکھے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے جو دروازے پر ملیگا کو رامیا سے باتیں کرتے دیکھا... تو کتاب پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا

‘ ‘ کیا بات ہے ...؟ ‘ ‘ ” انا سے کیا کہسر پھسر کر رہا ہے۔ مجھ سے بول کیا کہتا ہے۔؟ ”

جب تیری جورو کو لے جانے آؤں گا تو پھر تجھ سے بات کروں گا..... ملیگا نے ہنس کر کہا۔

ابے چپ تیری ماں کی... ” نرسیا نے اسے گالی دی۔ اتنی دیر میں ملی ملیگانے کونے میں کھڑی رنگی کا ہاتھ پکڑ ” ‘ ‘ کے کھینچا ..... ” سالی چلتی ہے یا ہاتھ پاؤں باندھ کر لے جاؤں.....؟ ”

بڑی دیر تک مراد اور سلیم نے نرسیا کے گھر چیخ و پکار سنی۔ وہ سمجھے دونوں بھائیوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ پھر مراد باہر نکلا۔ اس کے پیچھے سلیم تھا اور پھر سارے محلے والے گھروں سے باہر نکل آئے۔ اماؤس کی اندھیری رات میں کئی لڑکے چمکتی ہوئی در انتیاں ہاتھوں میں تھامے تحصیلدار کے بنگلے کی طرف دوڑ رہے تھے۔

توکیوں جارہا ہے سلیم۔ کیا سب کو جینے دے گا یا نہیں۔۔۔ احمد بی چلا رہی تھی۔

”ارے ان چھوکروں کو کیا ہو گیا ہے۔ اتنے بڑے لوگوں سے مقابلہ کریں گے۔“

رامیا کی بوڑھی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی۔ بہو پر تو ان بڑے لوگوں کا حق ہے۔ یہ بات وہ جانتی تھی۔ مگر آج تک اس کے شوہر، خسر، باپ، دادا کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ زبان کھولیں۔ اور جس نے کبھی چوں چاں کی صبح اس کی لاش کھیتوں میں پڑی ملی تھی۔

رنگی ابھی تحصیلدار کے کمرے تک نہیں پہنچی تھی کہ تین چارلز کے لاثہیاں اور درانتیاں تھا مے وہاں پہنچ گئے۔ جاتے ہی انہوں نے لاثہی کا ایک بھر پور وار ملیگا کے سر پر مارا کہ وہ تیورا کے گر پڑا۔ رنگی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شور و غل کی آواز سے پولیس پٹیل، گھڑو صاب، منشی جی، چپراسی سب جاگ پڑے اور سرکاری کاموں میں گڑ بڑ کرنے والے ان لونڈوں کو مزہ چکھانے آگے بڑھے پھر ملیگا کا حشر دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ نرسیا نے آگے بڑھ کے رنگی کا ہاتھ پکڑا۔ اور وہ سب اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے۔ ہر طرف سناتا چھا گیا۔ تحصیلدار صاحب نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ چیکنٹ پلی کی اندھیری رات کا سناتا جیسے کسی آنے والے طوفان سے پہلے کی گونج تھا کہ سارا گاؤں دھل گیا۔ گاؤں کے بڑے بڑے ساری رات جاگتے رہے۔ ہر جوان عورت کا دل دھڑک رہا تھا کہ اب جانے کیا ہوگا۔ تحصیلدار صاحب کے منہ کا شکار چھینا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی ایک عورت کی عزت کی قیمت اتنی زیادہ تو نہیں ہوتی کہ گاؤں کے سارے لوگوں پر آفت آجائے۔ یہ مستان کی باغی اولاد تو ابھی گاؤں میں جانے کتنے تماشے کرے گی۔ اور سب سے پہلے درانتی لے کر نرسیا دوڑا تھا۔ اگر تحصیلدار بھی بندوق تان کر آجاتا تو۔؟

سب دل ہی دل میں نرسیا اور مراد کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ خواہ مخواہ ذراسی بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ دھیروں کی اولاد۔ اب دماغ خراب ہو رہے ہیں بد معاشوں کے صبح سب ڈرے سہمے اٹھے اور نماز سے پہلے جنگولوں کی طرف لوٹے تھامے جانے لگے سلیم بھی اٹھا۔ روز کی طرح آج اس نے وضو کر کے نماز نہیں پڑھی نہ مراد کے ساتھ جنگل کی طرف گیا۔ چولہے کئے بیٹھ کر بیڑی پیتا رہا۔ احمد بی اور گوری بی چکی پیس رہی تھیں بی جانی چولہا سلگا رہی تھی۔ سارا گھر اہلوں کے دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ چھوٹے بچے بھی اٹھ گئے اور جلدی جلدی نماز پڑھنے بھاگے۔ پھر سلیم اٹھا، اس نے آنگن میں کھڑے گل مہر کے تھانولے میں تھوکا اور لاثہی اٹھا کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

ابھی مسجد میں اذان ختم ہوئی تھی۔ لوگ ہاتھوں میں لوٹے لئے کھیتوں کی طرف جارہے تھے کہ پکی سڑک کی طرف سے دھول سی اڑی۔ کالی گھوڑیوں پر دوسوار تھے۔ ایک تو سفید دھوتی پہنے ملیشم اور دوسرا سیاہ شیروانی پہنے، چوڑی دار پاجامہ اور ترکی ٹوپی لگائے تحصیلدار صاب تھے۔ ان کے سیاہ بوٹ ڈور سے چمک رہے تھے۔ پیچھے پیچھے پولیس پٹیل، تحصیلدار کے چپراسی اور ملیگا تھا۔ ان آدمیوں نے للکار کر کھیتوں پر جانے والوں کو پکارا۔

تم سب ادھر آؤ۔۔۔ تحصیلدار صاب سے بات کرو ”سب چونک پڑے۔ ضرورت کے لئے کھیتوں میں بیٹھے ہوئے لوگ “ گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈور ڈور کھیتوں میں لوگوں کی پر چھانیاں کی اُبھری تھیں۔

رامیا اور نرسیا تو ڈر کے مارے گھر میں چھپے بیٹھے تھے۔ مگر ملیگا کی غصہ بھری چیخیں سنیں تو وہ دونوں بھی اُٹھ کر دوڑے کھیتوں کی طرف۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ آج تحصیلدار اور ملیشم نرسیا کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

کہاں ہیں وہ رات میں شور مچانے والے چھوکرے۔۔۔“ ملیگا سرکو پٹی باندھے

چلا رہا تھا۔

یہ سنتے ہی سلیم نے لاثہی کاندھے پر رکھی اور سب سے پہلے آگے بڑھا۔ پھر کچھ اور کھیت مزدور بھی اس کے آگے آئے۔ حالانکہ رات وہ سب ڈر کے مارے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ کھیتوں کے کنارے کی گڑ بڑ دیکھ کر کچھ بوڑھے بھی لاثہی ٹیکتے کھانستے کھاتے گھروں سے نکل آئے۔ ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔ تحصیلدار صاب کی گھوڑی اُچھل رہی تھی۔ بنہاربی تھی۔ اور تحصیلدار صاب کا چابک شڑاپ شڑاپ ہوا میں لہر رہا تھا۔۔۔ پھر جانے نرسیا میں کہاں سے ہمت آگئی۔ وہ آگے بڑھا اور تحصیلدار صاب کے پاس جا کھڑا ہوا۔

‘ ‘ ..... کہو صاب آپ کو کیا بولنا ہے ہمارے سے ؟ ”

یہ دیکھ کر ملیگا آگے بڑھا۔ اس نے نرسیا کو اپنی لاثھی سے پیچھے ڈھکیل کر کہا۔

حرام زادے، آگے کہاں آ رہا ہے... گردن نیچی کر کے بات کر۔“ اس نے نرسیا کی گردن پکڑ کے زور سے جھکا دی۔

مجھے حرام زادے بولنا سوز کی اولاد.....“ نرسیا نے تلگو میں چلا کر کہا اور سلیم کے ہاتھ سے لاثھی چھین کر ” ملیگا کو مارنے آگے بڑھا۔ معاملہ سنگین ہوتا جا رہا تھا۔ اس لئے تحصیل کے چپراسی اور پولیس پٹیل گھوڑ و صاب نے ملیگا کو پیچھے ہٹا دیا۔ مگر نرسیا پر تو اس وقت بھوت سوار تھا۔

نیچے اُتر وصاب۔ بات کرو ہم سے۔ میرے کو بھی تمہاری جو رو پسند ہے۔ ایک رات ”

‘ ‘ کے لیے دیتے کیا.....؟

کیا بولا.....؟“ سارے لوگ کانپ اُٹھے۔ ملیشیم ملیگا اور پولیس پٹیل کے تڑا تڑا جوتے نرسیا کے سر پر برس رہے ” تھے۔ مگر تحصیلدار کی اچکتی ہوئی گھوڑی تھم گئی۔ ان کے ہاتھ میں لہراتا ہوا چابک تھم گیا۔ پان سے بھرا ہوا منہ تھم گیا۔ تحصیلدار کو یوں لگا جیسے گھومتی ہوئی زمین بھی تھم گئی ہو۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ پورے گاؤں کے لوگ جیسے ان کے سر پر چڑھے چلے آ رہے تھے۔

اچھا ان حرام زادوں کو مزہ چکھانا پڑے گا۔“ انہوں نے گھوڑی کو ایڑھ لگائی اور سریٹ دوڑنے لگے۔ اب وہ اس ” موڑ تک چلے گئے تھے جس کے آگے پکی سڑک حیدر آباد کی طرف جاتی ہے۔ ملیشیم تحصیلدار کے غصہ سے کانپ رہا تھا۔

اچانک معاملہ اتنا گڑ بڑ ہو جائے گا اسے اُمید نہیں تھی۔ پورے گاؤں والے باتھوں میں لاثھیاں تھامے چاروں طرف چپ ..... چاپ کھڑے تھے

بشرفِ ملاحظہ خدا وند نعمت حضرت بندگانِ عالی مدظلہ تعالیٰ عرض خدمت ہے کہ موضع چیکٹ پلی میں کمیونسٹ غنڈوں کا اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ گاؤں کے کھیت مزدور سرکاری کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں۔ سرکاری دفاتروں پر حملہ کر رہے ہیں۔ ہماری جان و مال کو خطرہ ہے اس لئے بندگانِ عالی سے التماس ہے کہ ان کی سرکوبی کے لئے پولیس کا سخت بند و بست کیا جائے۔

معروضہ نمک خوار پشتینی

نا در علی خاں رنگین

اپنے دفتر میں آکر نادر علی خاں رنگین تحصیلدار ماتھے سے پسینہ پونچھ کر بندگانِ عالی کی خدمت میں معروضہ لکھ رہے تھے۔ چیکٹ پلی کے تحصیلدار نادر علی خاں رنگین شاعر بھی تھے، اور دیہاتوں میں اپنی صدارت میں مشاعرے کروا کے ڈانٹ ڈانٹ کر داد وصول کرتے تھے۔ مگر اس بار ان کی رنگین بیانی کام نہ آئی۔ کیونکہ حیدر آباد میں یہ خبر عام تھی کہ کسان اور مزدور گاؤں میں سر اٹھا رہے ہیں..... ان کے سر پہرے لونڈے شہر کی عدالتوں میں جاگیرداروں اور دیشمکھوں کے ظلم و ستم کے خلاف آنے دن شکایتیں پیش کر رہے تھے۔ دلم (چھاپہ مار) دستوں کا زور تلنگانہ میں بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ لوگ کمیونسٹ پارٹی کی ہدایت پر کام کرتے۔ خود پارٹی کانگریس کے ساتھ دیش کی آزادی کے نعرہ لگاتی اور گاؤں میں نظام اور جاگیرداری کے خلاف مسلح جدو جہد کر رہی تھی۔ اس لئے اعلیٰ حضرت کے کئی فرمان مبارک جاری ہوئے۔ مزدوروں اور کسانوں پر بالکل سختی نہ کی جائے اور سرکاری عہدہ دار گاؤں میں ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کریں۔

ادھر سارے گاؤں والے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان لونڈوں نے تو آج غضب کر دیا۔ اتنی منہ زوری۔ اللہ جانے اب نرسیا کا کیا حشر ہوگا، اور سلیم کو کیا سزا ملے گی... ایک تو مستان نے وینکٹی کا قتل کیا۔ اس پر بھی ملیشیم اور اس کی ماں نے معاف کر کے ان لوگوں کو اپنے کھیتوں پر کام کرنے دیا..... مراد تو باپ کے رہن والی مدت پوری کر رہا تھا۔



سلیم ، احمد بی ، پاشو اور گوری بی ، بی جانی، ان سب کو مفت کی بیگار بھگتنا تھی ملیشیم کے ہاں۔ ادھر سلیم کو رتنائے گھر کے کام پر جو لگا دیا تھا تو وہ ملیشیم کی آنکھ بچا کر جنگل سے لکڑیاں چرا لاتا۔ پھر اور لڑکوں کے ساتھ سائیکلوں پر باندھ کر یہ لکڑیاں وہ ظہیر آباد جا کر بیچ آتا ہے۔ اس طرح ان لڑکوں نے گاؤں کے بس اسٹانڈ پر بیٹھنا شروع کیا وہاں شرفو نے نیم کے درخت تلے ایک چولہا جلا کر چائے کی دوکان لگائی تھی۔ پھر وہ ضلع کی دوکانوں سے پان بیڑی ، سگریٹ ، پیپر منٹ کی گولیاں، گڑ کے لٹو، اوہنے ہوئے چنے بھی بیچنے لگا۔ بس اس کی دوکان تو خوب چلنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی گاؤں کے لڑکوں کو وہاں بیٹھنے کا ٹھکانہ مل گیا ہے۔ یہ دیکھ کر رامیا کی ماں جو فاقوں سے تنگ آچکی تھی۔ وہاں ایک اور چولہا جلا کر بیٹھ گئی۔ اور عین اس وقت جب شہر کی بسیں آتی تھیں، وہ بیسن کی مرچیں اور پکوڑے تل کر بیچنے لگی۔ تھکے ہوئے بس ڈرائیور اور کنڈیکٹر شرفو کے ٹوٹے ہوئے پلنگ اور ادھر ادھر رکھے ہوئے پتھروں پر بیٹھ جاتے۔ وردی پہنے ہوئے یہ بس ڈرائیور گاؤں کے لڑکوں کی نظر میں بہت بڑی شخصیت تھے۔ وہ لوگ چائے پیتے وقت گاؤں کے احمق چھوکر کو بتاتے تھے کہ شہر میں مزدور کو دو روپے روز مزدوری ملتی ہے۔ وہاں چلتی پھرتی تصویروں کے تماشے میں ناچ گانے بھی ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی موٹر گزرتے وقت مجال ہے کوئی کتا بھی سڑک پر دم ہلانے۔

مہاراجہ سرکشن پر شاد تو سڑک سے گزرتے وقت دونوں ہاتھوں سے چاندی کے سکے اُچھالتے ہوئے جاتے تھے۔ اور پھر یہ ڈرائیور لوگ شہر سے اخبار بھی لانے لگے اس اخبار کو سلیم پڑھ کر سب کو سناتا تھا۔ سب لوگ اس پاس یوں اکٹھے ہو جاتے جیسے مولوی صاب کا وعظ سن

رہے ہوں۔ دار السلام میں اتحاد المسلمین کا شاندار اجتماع ... ۱۵ اگست کو ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ تمام ریاستوں کو انڈین یونین ... میں شامل ہونا پڑے گا۔۔۔ جواہر لال نہرو کا اعلان

چائے ختم کر کے ڈرائیور پُرانی ٹوٹی پھوٹی بس کو اسٹارٹ کرتا اور وہ کھڑ کھڑاتی ہوئی ظہیر آباد کی طرف چلی جاتی۔ جس کے پیچھے دیر تک کچی سڑک پر دھول کا غبار سا اٹھتا تھا اور یہ دھول چنگاریاں بن کر گاؤں کے نوجوان لڑکوں کے دلوں میں سلگنے لگتی۔ اور کسی کے دل میں نہ جلتی ہو مگر سلیم تو آپی آپ سلگنے لگا تھا۔ کئی بار وہ رات کو بہن بھائیوں کے ساتھ کھاتے کھاتے ہاتھ روک کر کہتا:

”مراد بھائی، اپنا گاؤں تو اُجاڑ ہو گیا ہے۔ اب کیسے پیٹ بھرنا۔۔۔۔۔ میں تو اب شہر کو جاتاوں۔“

کیا۔۔۔۔۔؟“ مراد نے بیڑی سلگاتے رُک کر اسے غور سے دیکھا۔“

اس چھو کرے کا دماغ خراب ہے کیا کہ شہر جانے کی سوچ رہا ہے۔ کہیں گاؤں والے شہر جاسکتے ہیں۔ وہاں سڑکوں پر اتنی موٹریں، سائیکلیں ، تانگے چلتے ہیں کہ نیا آدمی چلا جائے تو ذرا سی دیر میں قیمہ بن جائے اس کا۔

وہاں دو روپے روز مزدوری ملتی ہے۔ ڈلیور کی تنخواہ پچیس روپے ہے۔

جب بھی سلیم شہر جانے کا ذکر کرتا تھا مراد سے ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرا دیتا۔

سالانہ کام چور۔ محنت کرنے سے دم نکلتا ہے۔ دن بھر وینکٹی کے گھر میں گھسا، اس کی جو رو کی غلامی کرتا ہے۔“ ” مگر شرفو اپنے بھائی قاسم کو نہ روک سکا، اور ایک دن وہ چپکے سے شہر کی بس میں بیٹھ کر چلا گیا۔

یہ ظہیر آباد کی بس جب سے گاؤں تک آنے لگی ہے۔ لونڈے خود سر ہو گئے ہیں! ایک دن صابر میاں مرشد نے ملیشیم سے کہا:

”ہو صاب ! سالے منہ زوری کرنے لگے ہیں۔ کام چور ہو گئے ہیں۔“

‘ ‘ مگر ملیشیم راجہ جو مزدور اپنے پاس رہن ہے وہ تو نہیں جاسکتے نا؟“

جی ہاں صاب ، مگر ان کے چھوکرے بھاگ رہے ہیں نا۔۔۔۔۔ ملیشیم نے اپنی دھوتی کا پلہ سنبھال کر کہا۔ جب سے ” وینکٹی مرا تھا۔ ملیشیم شہر کی وکالت چھوڑ کر گاؤں کی جائیداد

سنبھالنے آگیا تھا۔

اجی کیا باتاں کرتیں آپ راجہ.....“ صاحب میاں نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے ”

کہا ”اجی حضت، جو مزدور آپ کے ہاں رہن ہے اگر وہ مر گیا تو اس کا جوان بیٹا کام کرتا کیا نہیں.....؟ اب اگر وہ بھی مر گیا تو اس کا چھوٹا بھائی کرے گا..... یہ باتاں ہمارے

بزرگان طے کر کے گئے ہیں۔ پھر اپن ان چھوکروں کو کیسے جانے دیں گے۔“ صاحب میاں نے تسبیح ختم کر کے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

جی ہو..... سچی بولے صاب.....“ ملیشم وکیل تھا مگر ایسے قانونی نکتے اسے سچھائی نہیں دیتیت ہے۔ یہ سب ” شہر کی ہوا کا اثر تھا کہ اسے گاؤں کے قاعدے قانون سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے۔

چنانچہ صابر میاں نے ایک دن درگاہ کے احاطے میں اپنے ہاں کام کرنے والے مزدوروں کو بلا کر کہا تھا۔

اچھی طرح سن لو تم لوگاں۔ اگر کسی کا بھائی یا بیٹا شہر میں مزدوری کرنے جا رہا ہے تو وہ اپنے لئے ہوئے قرض ” کی رقم پوری ادا کر دے ابھی۔ آخر ہمارا روپیہ مفت کا تو نہیں تھا جو تم لوگوں کو وقت پڑنے پر دیا تھا۔

”مگر سر کار آپ ہم کو قرض دیئے اور ہم تو یہیں ہیں۔“

چپ بیٹھو .....“ صابر میاں نے زور زور سے تسبیح پھیرتے میں کہا۔

قرض کرو آج تم مر گئے..... پھر ہماری رقم کیسے ادا ہوگی.....؟“ انھوں نے قہر بھری نظروں سے سب کو ” دیکھا اور سب گردن جھکا کر سوچنے لگے۔

”..... اگر آج ہم مر گئے..... اگر آج ہم مر گئے ”

بس سمجھو اپن تو مر ہی گئے ہیں..... باوا در انتی کا ایک وار اس سالے ملیشم کی گردن پر بھی کر کے مرنا تھا۔ سب ٹٹٹا ختم ہو جاتا..... سلیم آنگن میں لکڑیاں پھوڑتے میں بڑبڑا رہا تھا۔

ارے چپ بیٹھ گئے اجاڑ صورت..... باوا کو پھانسی پر چڑھا دیئے۔ ابھی ٹھنڈک نہیں پڑی کلیجے میں...“ جلدی ” جلدی امباڑے کی بھا جی توڑتے میں احمد بی نے چلا

کر کہا۔ وہ بڑی ڈرپوک تھی۔ بڑے آدمیوں سے تو ٹرنا ہی چاہیئے وہ ہمارے آن داتا ہیں۔ ان کا حکم مانا چاہیئے۔ زندگی سے سمجھوتہ کرنا اسے آتا تھا۔ مگر یہ سلیم کیسا خود غرض نکلا۔ قاتل باپ کا بیٹا..... جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ سن لیا نا کہ قاسم کے شہر جانے کی سزا، صابر میاں نے شرفو کو دی۔ اسے درخت سے اُلٹا لٹکا کر ٹانگوں پر اتنی لاٹھیاں ماریں کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ پھر اس کے رشتہ داروں کو حکم دیا کہ خبردار جو کسی نے اُٹھایا۔ رات بھر ایسا ہی پڑا رہنے دو اور آٹھ دن کے اندر اگر قاسم واپس نہیں آیا تو سب گھر والوں کو ایسی ہی سزاملے گی۔

.....امان میرا دماغ نکو کھا چپ بیٹھ.....سلیم جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا

میں تیرا دماغ کھا رہی ہوں، تو تو میری جان کھا لیا نا.....تیری طرف سے نرسیاً تحصیلدار صاب کو اتنی بڑی گالی ” ”دیا۔ اگر ایک بار رنگی تحصیلدار صاب کے ساتھ چلی جاتی تو کونسی آفت آگئی تھی۔ جو تم لوگ اتنا شور مچائے۔

احمد بی کمر میں اڑسی ہوئی تھیلی نکال کر پان بنانے لگی۔

سلیم نے ماں کے آخری جملے پر گھور کے اسے دیکھا..... جانے امان کتنے جاگیرداروں، تحصیلداروں اور ریڈیوں کے ساتھ سوئی ہوگی۔ اور خود سلیم جانے کس ریڈی کی اولاد ہے۔ جیہی تو باوا کو پھانسی کا حکم ہوا مگر اسے رونا نہیں آتا۔ یہ سب چھوکرے چھوکریاں جانے کونسی موریوں کے کیڑے ہیں... چھی... اس گھر میں رہنے سے تو اچھا ہے شہر کو بھاگ جانا۔

اماں ریڈیوں سے بھیک مانگ کر جی لے گی۔ یہ سب پوٹے کہیں نہ کہیں ٹھکانے لگ جائیں گے۔۔۔ بس بچارا مراد بھائی اکیلا رہ جائے گا۔ اسے اپنے بھائی پر بہت ترس آتا تھا۔۔۔ سارا دن بیل کی طرح ریڈی کے کھیتوں پر محنت کرتا ہے، مگر چپ چاپ بھی اپنی اتنی خوبصورت بیوی نوراً سے بھی ہنس کر بات نہیں کرتا۔ بھائی کتنی معصوم ہے۔ کتنی شرمیلی، صبر شکر والی۔ دن رات ساس اور دیورنندوں کی خدمت میں جٹی رہتی ہے۔ پھٹی ہوئی ساری کا پلوسر پر ڈالے ننگے بدن کو گود کے بچے سے چھپائے۔ بس میں شہر جا کر بھائی اور بھابی کے لئے خوب پیسے بھیجا کروں گا۔

سلیم بھائی کھانا کھاوتا.....؟“ سلیم چونک پڑا..... چولہے کنے سب بہن بھائی کھانا کھا رہے تھے اور اس کی ” رکابی بھابی نے اس کے سامنے جانے کب سے رکھ دی تھی۔ سلیم نے آہستہ سے امباڑے کی چٹنی چاول میں ملائی۔ پھر اس کی نظر سوکھے دبلے کھانستے ہوئے

مراد بھائی پر پڑی تو نوالہ رکابی میں چھوٹ پڑا۔

چٹنی میں آج مرچی خوب پڑ گئی۔ سلیم بھائی مرچی زیادہ نہیں کھاتا؟ بی اماں نے گھبرا کے کہا۔ آج اس نے خوب ” ”ہری مرچیں چٹنی میں کوٹ دی تھیں۔ نمک مرچ زیادہ ہو تو سالن کم کھایا جاتا ہے۔

ہنو۔ چٹنی میں مرچی خوب ہے“ سلیم رکابی میں ہاتھ جھٹک کر اٹھا اور موری کنے جاکر ہاتھ دھونے لگا۔ اس نے ” کھانے کا ایک نوالہ بھی منہ میں نہیں رکھا تھا، مگر اس کا سارا بدن مرچ کی تیزی سے جل رہا تھا۔ کلیجے میں آگ سی لگی ہوئی تھی..... احمد بی یہ بات سب کو بڑے فخر سے سنایا کرتی تھی کہ ریڈیوں کے ہاں کھانا کھانے سے مستان مرچ بالکل کم کھاتا ہے اور یہی عادت اس کے بچوں کو ہے کہ ذرا سی مرچ سالن میں زیادہ ہو جائے تو سلیم کھانا نہیں کھاتا۔

ہم لوگ ہمیشہ وینکٹی کی جھوٹن کھاتے ہیں نا اس لئے..... آخر اماں کو یہ کیا شوق ہے کہ اپنے شوہر اور بچوں کا ناطہ کسی نہ کسی طرح بڑے آدمیوں سے جوڑے۔

.....اس کی ماں کی سالی

.....سلیم کا جی چاہ رہا تھا۔ جلدی جلدی منہ چلانے والی اس بڑھیا کی پیٹھ پر ایک لات رسید کرے

صبح مسجد میں اذان کے ساتھ ہی گاؤں کے بچے اور کُتے مل کر خوب بھونکنے لگے۔ لوگوں کے چپخنے چلانے کی آوازوں کے ساتھ زور زور سے دھبڑا بجنے کی آواز آنے لگی۔ سب ہڈبڑا کے باہر کی طرف بھاگے اور گاؤں کی بڑی سڑک پر سے آنے والے ہجوم کو دیکھنے لگے۔

کا لک اور رنگ کے دھبوں سے رنگے ہوئے گدھے پر نرسیا سوار تھا۔ اس کا سر مونڈھ کر منہ کالا کیا گیا اور پورے بدن پر چونے سے داغ ڈالے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ رستی سے بندھے تھے اور ملیشم کے نوکر گدھے کے پیچھے زور زور سے دھبڑا بجا رہے تھے۔ بچے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ ساتھ چلنے والے اس گدھے کی طرف منہ کر کے تھوک رہے تھے، جس پر نرسیا سوار تھا۔

سابوکار کے حکم کو نہ ماننے کی سزا گاؤں میں کسانوں، مزدوروں کو دی جاتی تھی۔ یہ گاؤں کا بہت پرانا دستور تھا۔ گاؤں کے معزز لوگوں کے آگے بدتہذیبی کرنے والے کے پورے خاندان کے لئے یہ سزا ہوتی۔

اب سارے گاؤں میں اس جلوس کو گھمایا جائے گا۔ گاؤں کے بچے نرسیا کو گدھے پر بیٹھا دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجا کر ہنس رہے تھے۔

رامیا اپنے گھر کی دیوار سے پیٹھ لگانے، سر جھکائے، بیٹھا تھا۔ احمد بی، نورآ، گوری بی،

بی جانی اور اڑوس پڑوس کی عورتیں رامیا کی ماں اور رنگی کے ساتھ کھڑی رو رہی تھیں۔ نرسیا کا بوڑھا پڑوی یادئ کہہ رہا تھا:

ہم نہ کہتے تھے کہ ہوش میں رہو..... شہر کے لونڈوں سے بڑی بڑی باتاں کرنا”

”سیکھ لئے تو یہی ہوگا۔

مگر گاؤں کے کتوں کو یہ تماشا بالکل پسند نہ آیا تھا۔ وہ زور زور سے بھونک رہے تھے۔ آج نرسیا اور وہ گدھا، دونوں انہیں اجنبی لگ رہے تھے۔

بھوں..... بھوں..... بھوں..... وہ منہ اٹھا کر غصہ میں بھونک رہے تھے۔

بند کرو یہ تماشا..... مگر سلیم میں کسی کتے کی جتنی جرات نہ تھی کہ یہ بات زبان سے کہہ سکتا..... وہ اپنے گھر کی کچی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا بیڑی کے سٹے پر سٹے لگاتا رہا..... اس بات کو بھول گیا کہ یہ دیوار گرنے والی تھی۔ اور اس کے اتنے بوجھ کی تاب نہیں لائے گی۔

پھر رامیا آگے بڑھا اور سلیم کے گلے لگ کر رونے لگا۔ رامیا اور سلیم کے گھر کی سب عورتیں اور بچے اب اتنی زور سے رو رہے تھے جیسے گھر میں کوئی موت ہوگئی ہو۔ مگر سلیم نے نہ تو اسے محبت سے تھاما اور نہ اس کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔ رات کی چٹنی والی مرجیں اب اس کی آنکھوں میں گھر گئی تھیں کہ سرخ انگارہی ہو رہی تھیں۔ اب نرسیا برادری سے باہر ہو گیا۔ گاؤں سے باہر ہو گیا۔ گاؤں کے قانون کو توڑنے کی یہی سزا تھی۔ خاندان میں اسے کوئی بیٹی دے گا نہ بیٹی لے گا۔ شادی بیاہ میں اس کے ہاں نیوتے کی الاچی نہیں بھیجی جائے گی۔ اس کی ماں بہنوں کو کوئی گاؤں کے کنوئیں سے..... پانی نہیں دے گا

چوٹ کہاں کہاں لگے گی۔ ذلت کہاں کہاں برداشت کرنا پڑے گی۔ اس گدھے کو اب گاؤں کے باہر دھتکار دیں گے۔ رات بھر بھوکا پیاسا نر سیا جنگل میں اکیلا کسی پیٹر تلے بیٹھا اپنی حماقت پر پچھتائے گا۔ پھر صبح سویرے وہ گاؤں میں داخل ہوگا۔ ملیشیم کے پاؤں پر اپنی ناک رگڑے گا۔

دراصل اس کے منہ پر لگی ہوئی کالک تو ملیشیم ریڈی کے پیروں پر ناک رگڑنے سے ہی چھوٹ سکتی ہے۔ ورنہ پھر ساری گاؤں کی برادری کو ایک وقت کا کھانا کھلانا پڑتا ہے۔ اب کسی کی مجال کہ گاؤں کے کسی قانون کو توڑنے کی ہمت کرے۔ یہ چھوٹے چھوٹے بچے جو آج سبق سیکھ رہے ہیں۔ ان کے نانا، دادا بچوں کی انگلی تھامے کہہ رہے تھے۔

خبر دار بیٹا، جو کبھی اپنی بات سے پھرے۔ بڑے لوگوں کی بے عزتی کی۔ جنہیں بھگوان

نے بڑا بنایا ہے وہ بڑے ہی ربتے ہیں۔ ان سے منہ زوری کرنے والوں کو ایسی ہی سزا ملتی ہے۔ جب سے شہر کی بسیں گاؤں میں آنے لگی ہیں۔ نحوست آرہی ہے۔ ان بسوں میں شہر کی ہوائیں بھی آرہی ہیں۔ اور سات نسلوں سے یہ کوڑھ مغز رہنے والے چھو کرے جن کے باپ دادا نے کبھی بادام کھائے نہ کوئی میوہ چکھا، ان میں عقل کہاں سے آئے گی اسی لئے شہر کے لونڈوں کی باتوں میں آکر تیز ہوا میں اڑنا سیکھ رہے تھے۔ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے پر کٹے ہوئے ہیں۔ بچارے نر سیا کی قسمت..... اصل میں اس کی بیوی ابھا گن آئی۔ جب سے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا، گھر کا سکھ چین ہی اڑ گیا ہے... گاؤں کی عورتیں آپس میں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

یہ شہر کی بسوں کے ڈلیور اُجاڑ صورت چھوکروں کے دماغ خراب کر رہے ہیں۔ اُلٹی سیدھی باتاں سکھا کو..... ” کوئی عورت تحصیلدار سے بچ کر گاؤں میں رہ سکتی ہے.....؟“ احمد بی ناک پر انگلی رکھ کر کہہ رہی تھی۔

بچارے کی جوان بہنیں ، بھانجیاں کنواری رہیں گی..... اب انہیں بیابانے کو ”

‘ ‘ قرض دے گا۔؟

اماں ، اگر نر سیا اپنی برادری کو کھانا کھلا دے اور ریڈی اسے معاف کر دے تو پھر پوشاکی شادی ہو جائے گی نا؟“ گوری بی نے گھبرا کے پوچھا۔ پوشا اس کے بچپن کی سہیلی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ ریڈی کے کھیتوں پر کام کرنے جاتی تھیں۔

مگر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا غریبوں کے پاس۔ بس اللہ ، ملیشیم کے دل میں دیا ڈال دے..... وہ نر سیا کو معاف کر ” ‘ ‘ دے تو پھر

صبح ہوئی..... ملیشم ریڈی، وینکٹی کی کرسی پر بیٹھک میں آن بیٹھا۔ بڑی شان سے پاؤں پر پاؤں ڈالے ہلا رہا تھا۔ ہر آہٹ پر منتظر تھا کہ اب نرسیا آکر اس کے پیروں سے لیٹ جائے گا۔ اور وہ اس کے منہ پر ایک زور دار لات مار کے اس کی ماں بہنوں سے اپنے رشتے جوڑے گا۔ پھر جی بھر کے مارنے کے بعد اسے معاف کر دے گا۔ خبر دار جو آئندہ کبھی نظر اٹھانے کی ہمت کی..... جا، کل سے کھیتوں کے کنارے والی باولی کھودنا شروع کر دے..... اس کی ماں کی..... سارے گاؤں والے ملیشم کی اس عنایت پر کتنے خوش ہو جائیں گے۔ نرسیا کا خاندان تو خوشی کے مارے رو پڑے گا۔

کڑا کے کی سردی تھی۔ جنگل میں ایک پیڑ تلے ننگا بیٹا ہوا نرسیا تو کسی آگ میں پھنک رہا تھا۔ اس کے سارے بدن میں شدید درد تھا۔ بخار کی تیزی سے اس کی ہتھیلیاں جل رہی تھی۔ وہ دونوں گھٹنوں کے بیچ سر دبائے بیٹھا تھا کہ کسی نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اس کا سر اوپر اٹھایا۔ ٹھنڈے ہاتھ اس کی گرم کنبٹیوں پر برف کی ڈلیاں بن کر لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ ماں یا رامیا اسے جنگل میں ڈھونڈتے پھریں گے۔ سارے گاؤں سے چھپ کر آدھی رات کو اس کے لئے کھانا لے کر آئیں گے، جسے وہ پیروں تلے روند ڈالے گا۔

مجھے اب کچھ نہیں چاہیئے..... جاؤ یہاں سے۔ تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔“ نرسیا نے ہاتھ جھٹک ” دیئے، اور زور سے چلا یا۔

میں تمہارے ساتھ ہمدردی کرنے نہیں آیا ہوں.....“ کسی نے آہستہ سے اردو میں کہا۔ یہ اجنبی آواز سن کر نرسیا ” چونک پڑا۔ اندھیرے میں اس کے سفید کپڑے چمک رہے تھے

اور اس کا لمباقد نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ نرسیا کے پاس آبیٹھا تو شہر کے سگریٹ کی بو اس کے کپڑوں سے آ رہی تھی۔

‘ ‘.....میں تو صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آج تمہارا منہ کالا ہوا۔ کل تمہارے بیٹے کا ہوگا۔ پھر اس کے بیٹے کا“

اچھا اچھا ہونے دو..... تم کون ہو ہمارے کو جلانے والے..... نرسیا نے جھنجلا کر کہا۔“

ہوبھنی میرے کو کیا..... تمہارا منہ کالا ہونے دو۔ تمہاری جورو کو اٹھا کر لے جانے دو۔ میں کون ہوں بیچ میں ” “بولنے والا۔ تم جب تحصیلدار کے جوتے کھاتے ہو تو میں تماشہ دیکھنے آؤں گا۔

اچھا بس کرو اپنی بکواس..... نرسیا زور سے چلا یا..... وہ سمجھ گیا یہ کوئی بس ڈرائیور یا کنڈیکٹر ہے شہر کا جو یہاں سے گزرنے والی بس کا انتظار کرتے کرتے جنگل میں بھٹک گیا ہے۔

تم لوگ خوب باڑیں دیتے ہو۔ آج دیکھ لیا نا اس کا نتیجہ۔ تم شہر والے لوگ ہمارے گاؤں میں قدم نہیں رکھنا۔ خالی ” “..... بڑی بڑی باتاں کرنا آتا تمہارے کو

کون شہر والا.....؟.....میں..... نہیں میں تو گاؤں والا ہوں بھائی۔“

اگر میں شہر والا ہوتا تو کیا تمہارے منہ پر کالک لگی بول کے آج سارے جنگل میں تمہیں ڈھونڈتا پھرتا..... تھک گیا ہوں شام سے..... تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے

اچھا اب چپ بیٹھو.....“ بار بار منہ پر کالک لگنے کی بات یاد کر کے نرسیا کے کلیجے میں آگ دہک رہی تھی۔ ” بخار بھی خوب بڑھ گیا تھا۔ بھوک اور پیاس سے وہ نڈھال ہوا جا رہا تھا۔

وہ چپ ہو گیا۔ اپنی جیب سے ایک چار مینار سگریٹ نکال کر اس نے نرسیا کو دیا ، دوسرا

خود لیا۔ پھر جب وہ نرسیا کا سگریٹ سلگانے کے لئے بڑھا تو ماچس کی روشنی میں نرسیا نے دیکھا وہ ایک دبلا پتلا سا نو جوان تھا۔ پینٹ ، بش شرٹ پہنے صورت سے مسلمان لگ رہا تھا ، مگر اُردو میں باتیں کرنے کی بجائے تلگو میں بول رہا تھا۔ سگریٹ کی گرمی نے نرسیا کا غصہ کم کر دیا۔ اس نے جلدی جلدی دو تین کش لئے تو آدھی تھکن دور ہو گئی۔ سکون سا ملا۔

.....کون سے گاؤں کے ہو.....“تر سیائے آبستہ سے پوچھا”

“وہ سب باتاں معلوم کر کے کیا کرتے..... بس تمہارے گاؤں کے پاس ہی رہتا ہوں۔”

‘ ‘ کیا کرتے ہو۔ کھیتی باڑی۔ یا کسی جاگیردار کے ہاں رہن ہو.....؟“

اب کچھ بھی نہیں کرتا ہوں۔ میرے کھیت جاگیردار نے چھین لئے۔ گھر رضا کاروں نے لوٹ لیا۔ ایک بہن کو پولیس ” والے اٹھا کر لے گئے۔ بہت ڈھونڈا کہیں نہیں ملی۔ اب میری منگیتر ہے حیدرآباد میں کسی بنگلے میں نوکری کر کے اپنے ”چھوٹے بہن بھائیوں کو پالتی ہے۔ سنا ہے اماں گاؤں میں بھیک مانگ کر میرے اندھے باپ کو پالتی ہے۔“

سگریٹ کا بڑا کش لے کر نرسیا سوچنے لگا۔ اس کی بھالج بھی آج شاید تحصیلدار کے کمرے میں پہنچادی گئی ہوگی۔ اب اس کی ماں کو بھی بھیک مانگنا پڑے گا۔ پوشا کو کوئی پولیس والا اٹھا کر لے جائے گا۔

کیا تم اپنے مالک جاگیردار سے لڑے تھے.....؟

‘ ‘ .....ہنو“

نرسیا نے دیکھا اندھیرے میں اس کی آنکھیں شیر کی طرح چمک رہی تھیں۔

مگر..... مالکوں سے لڑائی جھگڑا کرو تو ہمارے گاؤں میں ہاتھ پاؤں توڑ ڈالتے ہیں۔ رہن کی معیاد بڑھ جاتی ہے۔ ”

”چھوٹے بھائی یا بیٹے کو بھی مفت کام کرنا پڑتا ہے۔“

ہنو ، میرا بھی پاؤں ٹوٹ گیا تھا۔ میری گردن پر بیلوں والی بنڈی کا جوار کھ رات بھر کھڑا کر دیے تھے۔ میرے ”

”سامنے میری بہن کو پولیس والے موٹر میں بیٹھا کر لے گئے۔“

نرسیا آپی آپ کانپ اٹھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑے کو منہ میں دبایا۔ بھیگی ہوئی کڑوی تمبا کو اس کے حلق تک چلی گئی۔

‘ ‘ .....آخ تھو“

کہاں تھوک رہے ہو.....؟ زمین پر..... اس نے بڑے کڑوے لہجے ”

میں پوچھا۔

تو اور کہاں تھوکوں...؟ ریڈی کے منہ پر.....“نر سیآ جھنجھلا گیا۔“

ہاں.....میں نے تھوکا ہے..... نواب راحت علی خاں کے منہ پر ان کی”

”سات پشتوں پر..... سالا بھونچکا رہ گیا..... وہ سمجھا تھا تھوکنا صرف اسی کو آتا ہے۔“

کیا.....! تم نے نواب صاب کے منہ پر تھوک دیا..... نر سیائے قابل یقین انداز میں کہا.....پھر.....پھر ؟ ”

پھر کیا ہوا.....؟

پھر میں نے اس کی کھڑی فصل جلا ڈالی۔ اس کا سالا شکار کھیلتے جنگل میں گیا تو اس کا پتہ ہی نہ چلا آج تک کہ ” کون سے شیر نے اسے پھاڑ کھایا۔ میں اس کے ام کی فصل لوٹ لی۔ وہ جس موٹر میں بیٹھ کر گاؤں آتا تھا۔ وہ موٹر پل کے نیچے ”گر گئی۔ مگر وہ سالا پھر بھی بچ گیا۔“

کونسا پل .....؟ ”نر ساپور کائل؟“ ”نرسیا نے تعجب سے پوچھا۔“

‘ ‘ ..... موٹر پل پر آئی ”

تو کیا تم بشیر ہو .....؟ ”نرسیا نے گھبرا کر پوچھا۔“

‘ ‘ ..... ہاں ”

کیا .....؟ ”نرسیا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا، جیسے اچانک وہ کسی بھوت کے سامنے آگیا تھا۔ ” باپ رے ..... بشیر علی کرشنا پور کا سب سے خوفناک ڈاکو۔ جانے کتنے انسانوں کا قاتل ..... لٹیرا، خوابوں ریڈیوں کی جان کا دشمن ..... گاؤں کی عورتیں اس کا نام لے کر بچوں کو ڈراتی ہیں ..... نہیں یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بھلا ایسا دبلا پتلا آدمی بشیر علی ہو سکتا ہے۔ آدھی رات کو جنگل میں بشیر علی کا نام لے کر مجھے ڈرانا چاہتا ہے۔“

اب گاؤں جاؤ گے تو بیلوں کی بجائے ریڈی کی بندھی کاندھے پر رکھ کر کھینچنا پڑے گی۔ اس کی لاتوں سے تمہارے ” ”دانت ٹوٹ جائیں گے ..... وہ تمہارے پیدا ہونے والے بچوں کو بھی ابھی سے رہن رکھے لے گا۔“

بنو بنو ..... معلوم ہے .....؟ ”نرسیا نے بیزار ہو کر کہا۔“

”تو پھر یہاں سے بھاگ جاؤ ..... کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں سے تم ریڈی پر پتھر پھینک سکو۔“

چپ بیٹھو جی ..... نرسیا نے چڑ کر کہا۔“

میرے کھیت ہیں۔ بہن بھائی ہیں۔ ماں ہے۔ کیا ان سب کو اکیلا گاؤں میں ”

‘ ‘ چھوڑ دوں۔؟

اجی وہ تو ویسے ہی مرجائیں گے۔ ابھی جا کر دیکھ لو ان کا حشر۔ اگر انہیں بچانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو ..... جلدی اٹھو ... اگر دن نکل گیا تو پھر تم کہیں نہیں چھپ سکو گے۔“

”..... کہاں جاؤں .....؟ کیا کروں ”

کالی رات کے اندھے غار میں اترتے وقت نرسیا کے ساتھ ملیشم سے نفرت کی آگ تھی ..... پھر بشیر علی کے قدموں کی چاپ اس کی راہ نمائی ..... انتقام کی آگ میں اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا ..... وہ آوازیں بھی نہیں جو خود اس کی رائفل سے نکل رہی تھیں ..... خوفناک جنگلوں میں ..... اندھے غاروں میں ..... بے رحم نوکیلی چٹانوں میں ..... اپنے پیروں کے چھالوں کو دیکھنے کی اسے فرصت ہی نہ ملی۔ کیونکہ پل بھر کی غفلت اسے موت کے منہ میں ڈھکیل سکتی تھی۔ ..... کرانتی کے لئے اٹھے قدم ..... کرانتی کے لئے جلی شمع

ایک دن کسی ندی کنارے سستانے بیٹھے تو بشیر علی نے یہ شعر اُسے گا گا کر سنایا۔

کیسی کرانتی .....؟ کونسی کرانتی ..... نرسیا کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ پہلے تو ملیشم سے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگا۔ اور اب اس سے انتقام کے جذبے نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ جب کبھی وہ اپنا لہولہاں بدن لئے کسی چٹان تلے سستانے کو بیٹھ جاتا تو ، آپا اپنے ہائی بلڈ پریشر سے کانپتے ہوئے بدن کو سنبھال کر کہتی۔

ہم ٹھیر نہیں سکتے نرسی۔ رکتے ہی موت ہمیں آدبوچے گی۔



آپا کے سر کی قیمت پانچ ہزار روپے تھی۔

جب گاؤں میں یہ خبر عام ہوگئی کہ اب سب کھیت مزدوروں کی شامت آنے والی ہے تو چند سر پہرے چھوڑ کر سلیم کے ساتھ مل کر وقار آباد کی تحصیل میں درخواست دی کہ گاؤں کے دیش مکھ اور جاگیر دار کھیت مزدوروں پر بڑا ظلم ڈھارہے ہیں ان کے گھر جلا رہے ہیں۔ ان کی بہن بیٹیوں کو زبردستی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ایسی ایک درخواست کی نقل حیدر آباد بھی ڈاک سے بھیجی گئی۔

بس پھر کیا تھا چیکٹ پلی کے تحصیلدار نا در علی خاں رنگین کی بھی طلبی ہوئی رنگین صاحب شاعر تھے اور اپنے مستقر پر اپنی صدارت میں مشاعرے کروا کے ڈانٹ ڈانٹ کر داد وصول کرتے تھے۔ مگر وہاں ان کی رنگین بیانی کام نہیں آئی۔ کیونکہ گاؤں والوں کی برہمی اب حکومت کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بن چکی تھی۔ نلگنڈہ اور اس کے آس پاس کے کئی گاؤں چھاپہ ماروں کے قبضہ میں تھے۔ کسانوں کی سرکشی بڑھتی جارہی تھی۔ سارے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کا زور بڑھ رہا تھا۔ وہ کانگریس کے ساتھ دیش کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں ساتھ دے رہی تھی اور تلنگانے میں جاگیرداری کے خاتمے کے لئے عملی جدوجہد کر رہی تھی۔

تلنگانے کی اس گڑبڑ نے ہندوستان کی تمام ریاستوں اور رجواڑوں میں کھلبلی مچادی تھی۔

چنانچہ چیکٹ پلی کے کسانوں کی شکایتیں سننے کے لئے بھی ایک کمیٹی قائم کی گئی ، اس کے لئے شہر سے ایک سرکاری وکیل آیا۔ گاؤں کا پولیس پٹیل، مالی پٹیل ، تحصیلدار دلاور علی خاں، چھوٹے نواب، صابر میاں ملیشہم ، کشٹیا ، اور گاؤں کی تمام معزز شخصیتیں جمع تھیں۔ سب گھبرائے

ہوئے تھے۔ کیونکہ سنا تھا کہ سرکاری وکیل بڑا بد دماغ ہے۔ تحصیلدار صاحب کی رنگین بیانی اور ملیشہم کی بذلہ سنجی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ صابر میاں کی شاندار دعوت کھا کر اس نے ڈکار تک نہ لی۔

آخر سارے گاؤں میں ڈھنڈورا پٹ گیا کہ آج تحصیل میں سارے گاؤں کے کسانوں اور کھیت مزدوروں کو بلایا گیا ہے۔ ان کی ساری شکایتوں کی سنوائی ہوگی۔ رات کو جگہ جگہ گاؤں والے اکھٹے رہے۔ ڈر کے مارے ان کے دل دھڑک رہے تھے ، سب سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ اگر سچ مچ کہا تو سا ہو گا ر دشمن ہو جائیں گے ، گاؤں میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ مگر سلیم اور اس کے ساتھ والے نوجوان کہتے تھے ، سرکاری وکیل ہے۔ ہم تو انصاف مانگیں گے۔ ہمارے ساتھ کوئی ظلم و زیادتی ہوئی تو ہم پھر جائیں گے حیدر آباد..... سنا ہے سرکاری وکیل بہت پڑھا لکھا ہے میں درجے پاس کئے ہیں اس نے۔ پڑائی مثل ہے کہ عالم کے سامنے جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔ آج سب باتیں سچ سچ کہتا ہوں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کتنے پرانے ڈکھوں ، زخموں کی یاد دلا رہے تھے۔ جسے دیکھو گھٹنوں میں سر دبانے یاد کر رہا ہے گھر گئے ، کھیت گئے ، زیور گئے ، بچے بڑے ہوئے ، نوجوان ہوئے ، بوڑھے ہو گئے۔ مگر مالک کے ہاں رکھے ہوئے ہاتھ رہن ہی رہے۔ پیٹھ کے گھاؤ ، سر کی چوٹ دل پر..... لگنے والے گھونسے

حرام زادو..... نمک حرامو..... جاؤ..... جاکر سناؤ اپنے دکھڑے۔“ صابر میاں صبح سویرے، نماز کے بعد ہاتھ ” میں تسبیح لئے ، کھیتوں کی منڈیروں پر چلاتے پھرے۔

”ہو صاب۔ آج ان سب کا حساب کتاب صاف کرلو۔ بس اب آگے اپنے سے کچھ لینے آنا۔ نہ ہاتھ پھیلانا۔

...تحصیل کی طرف جانے والے کسانوں کو دلاور علی خاں سنا رہے تھے

ارے سلیم تحصیل کو چل نا۔ دیر ہو رہی ہے۔“ رامیا نے سلیم کو آکر پکارا۔ ”

رامیا نے آج دھلا ہوا بنیان اور دھوتی پہنی تھی۔ بڑے صاحب کے سامنے جانا ہے۔ ساری رات جاگ کر اس نے اپنے ڈکھوں کے داغ چمکائے تھے..... دادا کے کھیت، پھوپھی کی شادی والے قرض میں ڈوب گئے..... چچا اور باوا نے زندگی بھر کشتیا کے کھیتوں پر مزدوری کی۔ پھر ملیشمن نے تحصیلدار کے لئے رنگی کو بلوایا۔ نرسیا رنگی کو لے آیا تو اسے گدھے پر بٹھا..... کر گاؤں کے باہر..... جانے کہاں چلا گیا وہ..... آج تک پتہ نہیں

را میا ابھی سے رونے لگا۔

اچھا، تو تم نے جب سے وینکٹ ریڈی کے کھیتوں پر مزدوری شروع کی ، اس کا کوئی کاغذ ہے تمہارے پاس.....؟

”کاغذ..... کیسا کاغذ سرکار.....؟“ قاسم نے تعجب سے پوچھا۔

ارے بابا تم جو ساہوکار سے قرض لئے ، اس کے بدلے کام کئے ، یہ سب کہاں لکھا ہے.....؟“ سرکاری وکیل نے ” جھنجھلا کر پوچھا۔

سرر کار..... یہ لکھنے پڑھنے کی باتاں ہم لوگاں نہیں جانتے..... ساہوکار جو بولا ، سو بات ٹھیک ہوتی حضور۔ ” ”وہی سب اپنے پاس لکھ کر رکھ لیتا ہے۔

جی ہاؤ صاب ! اسی واسطے تو یہ نمک حرام ہمارے اوپر الزام لگا رہا ہے۔ صاب۔ سارے

میں بولتے پھرتے ہیں کہ ہم لوگاں برسوں سے پھوکٹ میں مزدوری کرتے ہیں ساہوکار کی۔ اور ہم سے روز روز کتنا روپیہ لیتے ... ہیں، اس کا کوئی حساب کتاب یاد نہیں ہے کتنے

صابر میاں کی تسبیح اب بڑی تیزی سے گردش کر رہی تھی۔

نئیں سرکار ہم بھی بول رہیں... بوڑھے درگیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

ہم اپنی بھومی کی قسم کھا کر بولتے ہیں۔ ہم جتنا قرض لئے سب ہمیں یاد ہے۔“ جب تحصیل کے آنگن میں سب گاؤں ” والے جمع ہوئے تو بہت خوش تھے۔ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ انہیں اپنے سارے ڈکھ، ساری نا انصافیاں یاد آ رہی تھیں۔ آج سرکاری وکیل کے آگے وہ اپنا جی کھول کر رکھ دیں گے سب بتا دیں گے کہ یہ ساہوکار ، یہ جاگیر دار نہیں کتنا لوٹتے ہیں۔

مگر جب سرکاری جیب میں بیٹھ کر کالا کوٹ پہنے وکیل صاحب آئے تو سب ڈر کے مارے کانپنے لگے۔ وکیل صاحب پچاس پچپن کے بے حد خوش مزاج آدمی تھے۔ ابھی ملیشمن ریڈی کے ہاں وہ بہترین شراب پی کر بہترین کھانا کھا کر بہترین موڈ بنا کر آئے تھے۔ اس لئے انہوں نے خود ہی ہاتھ جوڑ کر سارے لوگوں کو نمسکارم کیا۔ ان کی یہ ادا سب کو بھا گئی۔... علم انکساری سکھاتا ہے۔ اسی لئے تو عقل مند لوگ کہتے ہیں، بچوں کو علم سکھاؤ۔

پھر نواب دلا ور علی خاں نے چیکٹ پلی کے لوگوں کی طرف سے وکیل صاحب کو بے حد خوبصورت پھولوں کا بار پہنایا، جو خاص طور سے حیدر آباد سے منگوا یا گیا تھا۔ جیسے شاہ کی درگاہ کے

سجادہ نشین صابر میاں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے بکریوں، مرغیوں، اصلی گھی کے ڈبوں اور بار یک چاول کے تھیلوں کے تحفے دیئے گئے۔

سب سے پہلے ایک بات سن لو تم لوگ..... وکیل صاحب نہ ہاتھ اٹھا کر زور سے کہا۔

‘ ‘...میرے سامنے کوئی جھوٹی قسم نکو کھاؤ۔ میرے کو ثبوت ہونا ثبوت’’

مگر تم تو بھومی کی قسم پر بھی اعتبار نہیں کر رہے ہو۔ تم سے کون بات کرے۔“ در گیا نے دل میں سوچا۔“

اگر تم لوگ مفت میں کسی کی مزدوری کرتے ہو۔ یا تمہارے اوپر کوئی ظلم ہوا ہے۔ تو اس کا ثبوت جلدی پیش کرو ”...میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی سنہری گھڑی دیکھ کر کہا۔

‘ ‘.....ایک ایک کر کے سامنے آؤ..... جلدی جلدی’’

یہ سنتے ہی خاجو نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ لنگی میں ٹٹولنے لگا..... وہ چاہتا تھا کسانوں پر ظلم کا ثبوت دینے سے پہلے وہ خود سامنے آئے۔ صابر میاں نے گتے چرانے کے جرم میں رات بھر اسے درخت سے اُٹا لٹکا دیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ کی بڈی ٹوٹ گئی۔ شہر کے ہسپتال والوں نے ٹانگ کاٹ دی۔

حضور..... سرکار.....“ وہ کانپتے ہوئے اپنی ٹانگ ٹٹول رہا تھا۔ پھر اس کی نظر اپنے بیٹے خلیل پر گئی جو کانپ ”رہا تھا۔ کیونکہ صابر میاں اسے قہر بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔

ہاں ہاں بولو ... جلدی بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا نا انصافی ہوئی ہے۔ سرکاری وکیل صاحب نے کورا کاغذ سامنے رکھ کر اپنا قلم کھول لیا۔

‘ ‘ تمہارا نام.....؟ ”

“جی خواجہ میاں۔“

‘ ‘ باپ کا نام.....؟ ”

“لال محمد ۔ ”

‘ ‘ تمہارے پاس کھیت ہیں.....؟ ”

“نہیں سرکار۔“

‘ ‘ کبھی بھی نہیں تھے یا اب نہیں ہیں.....؟ ”

پہلے تھے صاب۔ مگر ادھر پانچ سال پہلے پانی نہیں پڑا۔ میری بہنوں کی شادی کرنا تھی بول کے نواب صاب کے ”... پاس رہن رکھ دیا تھا صاب

‘ ‘ اچھا پھر ...؟ ”

خاجو نے تھوک نگل کر نواب صاب کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھوں کے جلال سے کانپ گیا۔

پھر ... پھر کچھ نہیں سرکار ” خاجو گھبراہٹ میں ہاتھ ملنے لگا۔

اچھا... تم بیٹھ جاؤ... اور کوئی ہے... سامنے آؤ ” وکیل صاحب نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔

جی صاب میں رامیا ہوں..... میں... میں ” اور رامیا کچھ کہنے سے پہلے رونے لگا۔

ہاں ہاں بولو... کیا ہوا تمہارے ساتھ ” وکیل صاحب نے نرمی سے پوچھا۔

ہنو۔ صاف صاف بتاؤ نا کہ تمہاری جورو کو کوئی تحصیلدار اٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا تمہارے بھائی کو کسی نے قتل کر کے پھینک دیا ہے۔ کیا تمہاری زمین چھین لی ہے؟ کچھ بھی کہانی سناؤ نا وکیل صاب کو..... بولتا کیوں نہیں گدھے.....؟ ”

ملیشم نے چلا کر کہا۔

... را میا ملیشم کی آواز سن کر گھبرا گیا۔ پیچھے سے اس کی بوڑھی ماں نے گھبرا کے اس کی دھوتی کا پلہ کھینچا

”تیرے پاؤں پڑتی ہوں باوا چپ بیٹھ جا۔ اپنے کو گاؤں میں جینا ہے۔“

صاب۔ میرا بھائی... میرا بھائی... ” رامیا ہچکیاں لے رہا تھا

...کیا ہوا ہے اس کے بھائی کو؟ ” وکیل صاحب نے ملیشم سے پوچھا

یہ ہمارے کھیت مزدور ہیں وکیل صاب ” ملیشم نے انگلش میں کہا۔

اس کا بھائی اپنا قرضہ چکائے بغیر گاؤں سے بھاگ گیا ہے۔ اب نہ یہ لوگ قرض

واپس کرتے ہیں نہ اس کے بدلے کوئی دوسرا آدمی کام پر بھیج رہے ہیں۔ اُلٹا ہمارے اوپر ہی الزام ہے کہ ہم لوگوں نے اسے قتل کروا دیا ہے۔

نان سنس... ” وکیل صاحب نے ہنس کر کہا۔

‘ ‘ اچھا اب کوئی اور ہے ”

”جی صاب میرا نام بالیا ہے۔“

”میں معین الدین ہو سر کار... میں بڑی مصیبت میں ہوں۔“

”... میں را ملو ہوں صاب۔ میری باؤلی (کنوئیں) پر زبردستی

میں آئی، ملیا، کشٹی، نارائنا، راملو، مراد، عبدال۔

مگر اپنے نام سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکے... حالانکہ ملیشم منہ سے سگریٹ نکال کر مسلسل کہے جارہا تھا۔

ا بے بولتا کیوں نہیں عدل۔ تم لوگوں کو ہم سے کیا شکایتیں ہیں اب بتاؤ نا چھٹیاں لکھ لکھ کر حیدر آباد کے دفتر کو ”

بھجتے ہو۔ اب کیا ہوا.....؟ آپ کو کیا بولوں صاب۔ یہ مزدور کی ذات ہی ہے ایمان ہوتی ہے۔ بنجر کھیتوں کے بدلے نقد روپیہ دیتے ہیں ہم۔ وقت بے وقت قرض لئے چلے جاتے ہیں۔ مگر کام کے نام پر جان نکلتی ہے۔ ہر جگہ روتے ہیں کہ ہم لوگ پھوٹ

میں کام کرتے ہیں۔ اب میں کچھ نہیں بولتا۔ آپ خود ان لوگوں سے پوچھ لیجئے... ابے اٹھتا کیوں نہیں لنگڑے بتاتا کیوں نہیں ، ‘ تیرے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے؟

مگر لنگڑا خا جو آج بہرہ بھی ہو گیا تھا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

اور تو ، رامیآ... اور تو را میآ... اور تو، نرسی... اور تو... اور تو...! سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ منہ بند تھے... باتھ بندھے ہوئے تھے... سرکاری وکیل صاحب کے کھلے ہوئے قلم کی سیاہی سوکھ گئی۔ سفید کاغذ سادہ ہی رہا۔ انہوں نے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر مجمع کی طرف دیکھا۔

”تو اب تم لوگوں کو کچھ نہیں کہتا ہے نا؟ چلو یہاں انگوٹھا لگاؤ۔ سب اُٹھو۔ جلدی جلدی آؤ۔“

ایک کے بعد ایک آگے بڑھا۔ سرکاری وکیل کے سامنے جو سیاہی بھری رکھی تھی اس میں اپنا انگوٹھا ڈبو کر سفید کاغذ پر لگا نا گیا۔

اسی لئے تو گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتیں کہتی ہیں کہ بچوں کو مت پڑھاؤ علم جھوٹ سکھاتا ہے... سیاہی میں قلم کوڈ بو کر سفید کاغذ کو بھی سیاہ کر دیتا ہے۔

صاب میرے کو ایک بات بولنا ہے“ اپنی باری آنے پر رامیآ رک گیا۔ ”افوہ... ابھی پوچھا تو کچھ بھی نہیں بولتا ہے کہا“ نا تم نے“ وکیل صاحب کو غصہ آ گیا۔

خیر..... جلدی بولو..... کیا کہنا ہے.....؟ وکیل صاحب گھڑی دیکھنے لگے۔

صاب میری جور کو تحصیلدار صاب کے آدمی زبر دستی پکڑ کے لے گئے۔

میرا بھائی نرسیآ..... را میا بری طرح کانپ رہا تھا..... جیسے میلوں دور سے دوڑ کر آیا ہو..... جیسے اس بات کو کہنے کی ہمت صدیوں سے اکٹھی کر رہا ہو۔

‘ ‘ ہاں..... پھر کیا ہوا.....؟“

میرا بھائی نرسیآ اسے چھڑا کر لے آیا تو میرے بھائی کو ، لوگاں بھوت مارے سرکار... اسے گدھے پر بٹھا کر... رامیآ اب زور زور سے رونے لگا۔ آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔

‘ ‘...اچھا... پھر کیا ہوا... آگے بول“

مگر اب وکیل صاحب کا قلم کاغذ پر نہیں چل رہا تھا... وہ لکڑی کی میز پر قلم سے چڑیا کی شکل بنانے میں مصروف تھے۔

”ابے بول نا سالے..... جھوٹی باتاں بنانے میں تو خوب ماہر ہیں یہ لو گاؤں۔“

صابر میاں نے اپنی تسبیح کی گردش تیز کرتے ہوئے کہا۔

اب کیا بولوں صاب۔ یہ دونوں بھائیاں بڑے غنڈے ہیں۔ اس کا بھائی تو کمیونسٹاں میں مل گیا ہے کتے... بچارے ہمارے ” ریڈی صاب پورے خاندان کو مزدوری دیتے ہیں۔ سات پشتوں سے پال رہے ہیں ان لوگوں کو۔ اور یہ لوگاں سرکاری کام سے آنے والے عہدہ داروں کو مارنے کے لئے جاتے ہیں۔“

صاب... صاب... رامیآ ہکلانے لگا تو وکیل صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے صابر میاں کو چپ کرایا۔ ”

‘ ‘ ہاں، بول اور کیا ہوا...؟ ”

صاب رات کے وقت میری جور وکوز بر دستی پکڑ کے لے گئے تھے، جب سے میرے ”

سے دشمنی پکڑے یہ لوگ۔ میرے بھائی کا منہ کالا کر کے ، گدھے پر بٹھا کے گاؤں کے باہر کاں بھیج دئیے۔ آج تک اس کا پتہ ‘ ‘ نہیں چلا

بابا، بابا، بابا... سرکاری وکیل کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ ”

‘ ‘ .....، تو پھر کیا ہوا...؟ آپ کے گاؤں میں بڑی دلچسپ سزا دیتے ہیں غنڈوں کو Fantastic ”

وکیل صاحب کے قہقہوں نے ساری فضا کو اجال دیا ، ملیشزم ریڈی، پولیس پٹیل، مالی پٹیل، صابرمیاں ، پنتلو سب ہی قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے۔

‘ ‘ .....ہاں..... پھر کیا ہوا ”

اور کچھ نہیں بولنا ہے صاب۔ بس بیچ بات تھی۔“ رامیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔“ اچھا تو اب اجازت دیجئے۔“ وکیل صاب ” نے تمام معززین سے مرغ کے قورمے کی خوشبو میں بسے ہوئے ہاتھ ملائے۔ پھر وہ کھڑے ہو گئے۔ اپنے سامنے میز پر رکھے ہوئے پھولوں کے گجرے میں سے ایک پھول نوچ کر انہوں نے مجمع پر ایک نظر ڈالی۔

بھائیو..... آج آپ نے یہاں جمع ہو کر اپنی جو شکایتیں مجھے سنائی ہیں میں ان پر ضرور غور کروں گا۔ مگر آپ ” لوگوں سے ایک بات کہنا ہے کہ غنڈوں کے بہکاوے میں آکر مالکوں کے مال کی چوری کرنا اور سرکاری عہدہ داروں کے کام میں دخل دینا جرم ہے۔ اس کی بڑی سخت سزا ملے گی۔ حضور بندگان عالی کا فرمان ہے کہ ان کی رعایا پر کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی۔ سب کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔“

یہ سنتے ہی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کیں۔ انہیں تالیاں بجاتا دیکھ کر گاؤں کے بچے بھی تالیوں کے ساتھ شور مچانے لگے۔ وکیل صاحب کے ساتھ شہر جانے والے ٹوکروں میں بند مرغے بھی خوشی کے مارے بانگ دے رہے تھے.....

پھر صابر میاں کے لڑکے نے بھونپو والے گراموفون پر ایم ، اے رؤف کا ریکارڈ لگایا۔

تا ابد خالقِ عالم یہ ریاست رکھ

تجہ کو عثمان بہ صدا جلال سلامت رکھے

اور پھر اس کے بعد گراموفون کی سوئی ایک جگہ آکر رُک گئی۔

...جیسے تو... جیسے تو... جیسے تو

سلطنت آصفیہ...“ ملیشزم ریڈی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”

...زندہ باد...“ مجمع پکار اٹھا ”

...اعلیٰ حضرت

پائندہ باد

چنانچہ سرکاری وکیل نے جھٹ قلم اٹھا کر سفید کاغذ کو سیاہ کرنا شروع کر دیا۔

بملا خط گرامی ، حضور اقدس سر کار عالی

!عالی جاہ

معروض خدمت ہے کہ یہ حقیر بندہ پر تقصیر موضع چیکٹ پلی ، تعلقہ بند و گورہ ضلع وقار آباد گیا تھا۔ تمام گاؤں کے مزدوروں اور کسانوں کو اکٹھا کر کے دریافتِ حال کیا۔ لیکن ایک بھی کسان یا مزدور نے کسی جاگیردار یا سابوکار کے خلاف کوئی شکایت نہیں کی۔ تمام رعایا نہایت سکون و چین کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سارا گاؤں سلطنتِ آصفیہ کی سلامتی کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ فقط

شرح دستخط

سید غلام علی

مگر سلطنتِ آصفیہ کے زندہ باد کے نعرے اب بہت زور دار نہیں رہے تھے ہندوستان

کی آزادی میں چند دنوں کی دیر تھی۔ اتحاد المسلمین کے جلسے جگہ جگہ ہو رہے تھے۔ کمیونسٹوں کے چھاپہ مار دستوں کے حملے، کسانوں اور مزدوروں کی بغاوت ... پھر ان خبروں کو اعلیٰ حضرت تک پہنچایا جاتا تھا۔ میلی شیروانی پر اٹکا پاجامہ، پرانی چپلوں کو گھسیٹتے ہوئے ، حضور کنگ کوٹھی کے ورائنڈے میں ایک کرسی پر آ کر بیٹھ جاتے۔

‘ ‘ وہ بہادر خاں کل کے جلسے میں کیا بولا کتے ”

تب جاسوس نواز جنگ کھڑے کھڑے جلدی جلدی ہاتھ جوڑے سر جھکائے نہایت مناسب الفاظ میں نمک مرچ لگالگا کر، وہ باتیں سناتے جو کسی جلسے میں نہیں کہی گئی تھیں۔ مگر حضور کو اسی طرح سنانا ضروری تھا۔

جس دن مستان کو پہانسی دی جانے والی تھی۔ احمد بی سب بچوں کو لے کر اس سے ملنے گئی۔ آخری بار مستان کو کھلانے کے لئے اس نے گڑ اور دال بھر کے میٹھی روٹی پکائی تھی۔ وہ لوگ گھر سے جانے لگے تو سارے گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سب مل یوں رور بے تھے جیسے گھر سے میت اٹھتے وقت روتے ہیں۔

احمد بی نے روتے روتے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ سر پر خاک ڈالی۔ بچے چھاتی پیٹ پیٹ کر زمیں پر مچل رہے تھے۔ مراد سارے گاؤں والوں سے گلے مل کر روربا تھا۔ مگر سلیم جیسے پتھر ہو گیا تھا۔ وہ دونوں باتھوں سے سر تھامے چپ چاپ بیٹھا ز میں گھورے جارہا تھا۔ اسے زبردستی رُلاؤ۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں کا نا پھوسی کر رہی تھی۔ کہیں اپنے غم کو دل میں اتار کے بے ہوش نہ ہو جائے۔ اب ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا پالن بار تو وہی تھا۔... مراد ٹھیرا بال بچوں والا۔ پھر ملیشتم ریڈی کہ ہاں رہن تھا ، باپ کے بدلے۔ گاؤں میں سولہ سترہ برس کے لڑکے ہل بیل لے کر صبح سے شام تک کھیت میں کھڑے رہتے ہیں۔ مگر سلیم کبھی کھیتوں کے کام کو نہیں گیا۔ وہ لکڑیاں بیچنے گاؤں جاتا۔ بس اسٹاپ پر بیٹھ کر بیڑی پینا۔ یا پھر وینکٹی کے گھر میں رتنّا کے کام کرتا تھا۔ وینکٹی کی ماں پوشما سے سب نے کہا .....سانپ کا بچہ سنپولا ہوتا ہے۔ اس مسلمان چھوکرے کو گھر سے نکالو۔ مگر کیسے.....؟ اس نے رتنّا کے چھوٹے بچوں کو اپنے کلیجے سے لگا لیا تھا۔ وینکٹی کے مرتے ہی اس کی ماں پوشما تو بچھونے پر گر گئی تھی۔ مہینے میں دو تین بار ملیشتم و قار آباد سے ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آتا تھا۔ اماں کی گرتی ہوئی حالت دیکھ کر دونوں بہنیں ورا لکشمی اور سدا لکشمی ماں کو دیکھنے آئیں۔ ملیشتم تو جیسے شہر میں وکالت کرنا بھول ہی گیا۔ ماں اور بہابی کی دلجوئی

میں لگا رہتا۔ خود اس کی بیوی راج لکشمی دن رات چولھے چوکے میں لگی رہتی۔ اناج پھٹک رہی ہے۔ چاول اور جوار صاف کر رہی ہے۔ مرغیوں کو دانا ڈال رہی ہے۔ بھینسوں کا بارّہ دھو رہی ہے۔ لوگ اس کے وجود اس کو بھول گئے تھے۔ وہ خود بھی کبھی اپنی موجودگی کا احساس ہی نہ دلاتی تھی۔ ملیشتم دن بھر بیٹھک میں بیٹھا ، حساب کتاب میں مصروف رہتا تھا۔ جائیداد کی



دیکھ بھال ، بینک کا اکاؤنٹ، گھر کا خزانہ ، سب اس نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ کیونکہ وینکٹی کے بچے ابھی چھوٹے تھے اور رتنّا صرف انیس برس کی تھی۔ بھلا انیس برس کی اتنی خوبصورت لڑکی تنہا زندگی کیسے گزارے گی۔ یہ بات کوئی اور نہ سوچے۔ ملیشّم تو سوچ رہا تھا۔ حالانکہ رتنّا اب بھی ملیشّم سے چھپتی پھرتی تھی۔ اسے جانے کیوں اپنے دیور سے بے حد ڈر لگتا تھا..... وہ کبھی اس کے سامنے تھالی پر سونے آتی نہ کوئی بات کرتی۔ ملیشّم لاکھ اس سے کوئی ضروری بات پوچھنا چاہتا تو وہ ساس کے پاس جا کر کہہ دیتی۔

“ ملیشّم اُٹا کو بولو، میرے کو نہیں معلوم کھیتوں کے کاغذ کہاں ہیں۔ ”

اس نے وینکٹی کی ساری الماریاں بند کر دی تھیں۔ کنجیاں چھپادیں اور خاندان کی عورتوں کے بیچ بیٹھ کر بار بار کہتی تھی۔

مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے بچوں کے بڑے ہونے تک سب کام خود سنبھالوں گی۔

لیکن ملیشّم اب شہر سے آتا تھا تو اس چوکی پر بیٹھتا تھا، جہاں وینکٹی بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا صندوق کھول کر جانیداد کے کاغذ الٹا پلٹا... وینکٹی کا سگریٹ کیس کھول کر سگریٹ پینا۔ پھر بھابی سے چائے کی فرمائش ہوتی۔ چٹی اور سرّی دھر کو گود میں بٹھا کر مٹھائی کھلاتا تھا۔

پھر ایک دن وہ رتنّا کے کمرے میں چلا گیا اور وینکٹی کے پلنگ پر جا کر چینی کے پاس لیٹ گیا۔

رتنّا چولہے کے پاس سے گرمی میں گھبرائی ہوئی اندر آئی تو دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی اچھل پڑی..... مسہری پر وینکٹی.....! ویسا ہی بھرا بھرا بدن..... ویسا

بی بدن ، ویسے ہی ہاتھ..... رتنّا بے اختیار مسہری کے پاس چلی گئی..... جی چاہا ان باتھوں کو..... پھر دُور ہٹ گئی..... اوئی ماں..... یہ میرے پلنگ پر سو رہا

ہے..... شیطان..... بھابی..... سلیم..... اگے او سلیم..... ارے تو کہاں مر گیا۔ جلدی ادھر آنا... اور پھر اس نے آنگن میں کھیلنے ہوئے چار برس کے سرّی دھر کو اٹھا کر اپنے کانپتے ہوئے کلیجے سے لگالیا۔ یوں جیسے چار برس کے بیٹے کی پناہ میں آکر وہ ہر خطرے سے محفوظ ہو جائے گی۔

کیا ہوارتنّمآ..... ڈرگئی کیا.....؟“ گوہر میں سنے ہوئے ہاتھ ”

جھٹکنا سلیم آنگن میں آیا اور خوف سے کانپتی ہوئی رتنّا کو دیکھ کر اس نے آنگن میں رکھی ہوئی لاٹھی اٹھائی۔

‘ ‘ تمہارے کمرے میں سانپ سے کیا رتنّمآ.....؟ ”

سانپ..... رتنّا نے خوف سے تھرا کر سوچا۔ ہاں وہ سانپ ہی تو ہے سلیم نے وینکٹی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا..... ملیشّم ریڈی رتنّا کی مسہری پر سور با سانپ تھا..... سانپ..... اس کی لاٹھی ہوا میں لہرائی ، اور نیچے گر پڑی.....

جیسے اس کے ہاتھ میں لاٹھی نہیں درانتی ہو۔ اور باوا اس کا ہاتھ پکڑ کے کہ رہا ہو۔

اس سے کب کیا کاٹنا ہے، یہ میں جانتا ہوں۔ جا کوئی اور کھیل کھیل..... پلنگ پر ملیشّم کو سوتا دیکھ کر سلیم پوری بات سمجھ گیا اور اس نے رتنّا کی گود سے سرّی دھر کو لے کر کہا۔

تم اب بہت ڈرنے لگی ہو رتنّمآ... کیا دیول پوجا کرنا چھوڑ دیا...؟“ مگر اب وہ رتنّا کی طرف دیکھتا ہی نہ تھا۔ جیسے ” وہ سات رنگوں میں رنگی ہوئی۔ جھلملاتی ، جگمگاتی ، رتنّا بھاپ بن کر اڑ گئی ہو..... اور اس کا سفید پیولا اب سلیم کو نظر نہ آتا ہو..... وہ رتنّا سے بات کرتا تو یوں جیسے اندھے اپنے مخاطب کو دیکھے بغیر بات کرتے ہیں۔ باوا نے کتنا بڑا پاپ کیا ہے یہ... وہ اپنے باپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا جس نے رتنّا کے سارے رنگ چھین لئے۔

مستان کا چالیسواں ہو گیا تو خواجہ بی کے سسرال والے آئے۔ کسی دھوم دھام کے بغیر وہ نکاح پڑھا کے خواجہ بی کو لے جانے والے تھے۔

خواجہ بی اب دن بھر منہ لپیٹے کونے میں پڑی کھانستی رہتی تھی۔ اب اس نے مزدوری پر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ سب بھائی بہن اور اس کے بھائی نور آسمجھتی تھی کہ باپ کے غم نے اسے نڈھال کر دیا ہے۔ مگر جب وہ بار بار موری کے پاس جا کر ابکائیاں لینے لگی تو ایک دن نور آ نے اپنی ساس کے پاس بیٹھ کر آہستہ سے کہا۔

‘ ‘ اگے اماں۔ یہ خواجہ بی کو کیا ہو گیا ہے اے اللہ...؟ ”

...احمد بی، نے سنا تو تھر تھر کانپنے لگی۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور بیٹی کا یہ حال

اب تو گاؤں والے برادری سے باہر کر دیں گے۔ چھوٹی بہنیں عمر بھر کنواری بیٹھی رہیں گی... بھائیوں کو کوئی بیٹی نہ دے گا۔

ملیشم نے جو ہر وقت سلیم کو اپنے سر پر سوار دیکھا تو ایک دن گڑ چرانے کے الزام میں خوب لاتیں ماریں اور کہہ دیا کہ اب وہ گھر میں قدم نہ رکھے۔

اور بیٹی کے ہاں سے باسی کھانا مل جاتا تھا بچوں کو..... وہ بھی بند ہو گیا۔ اسے میں کشکول گاؤں والے خواجہ بی کو لینے آئے تو احمد بی نے جھٹ نکاح پڑھوا کر اسے بندٹی میں بٹھا دیا۔

ایک بیل کی بندٹی میں سرخ چادر اوڑھے خواجہ بی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے باسی پھولوں کی لڑیوں والا سپہا باندھے اونچا پورا شابو بیٹھا تھا..... کتنا تگڑا تھا وہ..... جانے میرا حشر کرے گا۔

جب بندٹی گھر کے پاس پہنچی تو سب سے پہلے شابو کی نانی ان کے پاس آئی۔ اور دونوں کی بلانیں لے کر بولی۔

”اللہ میاں گھر بھر کے اولاد دو۔ گھر میں کام کرنے والے ہیں ہاتھ آجائیں۔“

اس دُعا پر شابو بہت خوش اور اس نے جھک کر اپنی دلہن کی طرف دیکھا، جو ابھی تک دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے ماں کی یاد میں سسکیاں لے رہی تھی۔

”ہر وقت روتی صورت بنا کر اماں کو یاد کرے گی تو وہیں پٹک کو اؤں گا۔“

دوسرے دن شاہو نے اسے اُداس دیکھ کر کہا تو خواجہ بی نے جھٹ اپنے آنسو پونچھ لئے۔

جھے مہینے گزر گئے..... احمد بی بار بار اس راستے کی طرف دیکھتی تھیں۔ جدھر شابو خواجہ بی کو لے گیا تھا۔

پھر ایک دن کنکول سے ایک آدمی آیا اور اس نے احمد بی کو سنایا کہ خواجہ بلی کے لڑکا ہوا ہے..... شادی کے جھے مہینے بعد لڑکا.....؟

ڈر کے مارے سارا گھر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کیونکہ شابو کی ماں نے پنچائیت بلائی تھی... مراد نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے، کنکول جا کر خواجہ بی کی ساس کے پیروں پر اپنی پگڑی رکھ دی..... مگر یہ تو گاؤں کی عزت کا سوال تھا..... شرم سے منہ چھپائے، چادر میں لپیٹی ہوئی احمد بی جب کنکول کی اور جانے لگی تو اسے اب خواجہ بی کی لاش آنگن میں رکھی نظر آرہی تھی۔

گاؤں کی عورتیں، سر ڈھانپے، ناک پر انگلی رکھے، احمد بی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں..... اللہ ایسا وقت کسی ماں پر نہ ڈالے۔ پیسے کے لالچ میں وینکٹی کی دیوڑھی بھیج دیتی تھی جو ان چھوکری کو۔

احمد بی کنکول پہنچی تو پنچائیت کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔

پندرہ دن کے بچے کو چھاتی سے لگائے ، چادر میں منہ چھپائے ، خواہ بی ، سر جھکائے بیٹھی تھی۔ احمد بی کے ساتھ چیکٹ پلی کے دو پنچ وہاں بلوائے گئے تھے اگر بات اپنے ہی گاؤں کی ہوتو گاؤں کے پانچ پنچ اور ایک پولیس پٹیل مل کر معاملہ سلجھا دیتے ہیں۔ مگر جب دو گاؤں کے بیچ کوئی بات ہو تو دوسرے گاؤں کے پنچوں کو بھی بلانا ضروری ہے۔ چیکٹ پلی سے خواجہ میاں اور راج لنگم آئے تو سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اپنے گاؤں کی بیٹی کی عزت تو سارے گاؤں کی عزت ہوتی ہے۔ اس لئے کنکول والوں کا تھوک ان کے منہ پر پڑے گا آج... یہ کوئی معمولی سی بے عزتی ہوگی؟

پنچائیت شروع ہونے سے پہلے احمد بی اور خواجہ بی گلے مل کر اتنا روئیں کہ خواجہ بی بے ہوش ہو گئی ، اور بچہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر گر پڑا۔ شابو نے گھبرا کے جلدی سے بچے کو اٹھایا اور روتے ہوئے بچے کو اپنی چھاتی سے لگا کر تھپکنے لگا۔ شابو زیادہ سے زیادہ بیس برس کا ہوگا۔ مگر بچپن سے محنت کرنے کی وجہ سے وہ بہت لمبا مضبوط ہاتھ پاؤں والا اتنا بڑا نظر آنے لگا تھا کہ سب پنچ اسے سراٹھا کر دیکھنے لگے احمقوں کی صورت ، پھٹی ہوئی لنگی اور میلا بنیان پہنے۔ شابو کو کبھی ڈھنگ سے بات کرنا نہیں آتی تھی۔ کوئی سو بار پوچھے تو ایک بار وہ لڑکھڑاتی زبان سے جواب دیتا تھا... پنچائیت ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ چیکٹ پلی کا ایک پنچ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مگر بچے کو چھاتی سے لگائے شابو کو دیکھا تو کنکول کی مسجد کے مولوی صاحب نے پوچھا.....”بول

‘ ‘ اے شابو پہلے تو بتا یہ بچہ تیرا ہے یا نہیں.....؟

.....ابو اماں ! تم لوگ ان بچے کو کیا.....؟ شابو کی تیز طرار ماں نے اپنا ماتھا پیٹ کر کہا

ارے اس کی شادی کو ابھی چھٹا مہینہ ہی شروع ہوا ہے نا.....یہ دیکھو! وہ انگلیوں پر مہینے گننے لگی۔ بندہ .....نواز.....مدار..... خواجہ معین الدین

اجی تم چپ بیٹھو ہم اللہ ب.....مولوی صاحب نے بڑھیا کو ڈانٹ دیا..... مجھے پہلے اس چھو کرے سے بات کرنے..... دو.....بول رے شابو

شابو گھبرا گیا اور اپنا جو بھر اسر کھجانے لگا۔ وہ بچے کے ننھے سے ہاتھ کو اپنے سخت ہاتھ میں دبا کر آہستہ سے بولا۔

یہ تو میرا ہے... میں کسی کو نہیں دوں گا۔“ اس نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔

تیرا ہے...؟“ کنکول کے سب پنچ اچھل پڑے۔ گاؤں کے بڑے بڑے اور شابو کی ماں تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے۔

‘ ‘ .....اے کیا بول رہا ہے... صاف صاف بول نا”

اب آپ لوگ کیا تو بھی بولو.....میں بچے کو تو نہیں دوں گا۔ اس نے سب کی

طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔

لو.....سن لیانا.....؟“ کنکول کے سارے پنچوں کی گردنیں یوں جھک گئیں جیسے شابو نے خود ان پر حرام کاری ” کا الزام لگایا ہو۔ خواجہ بی اور احمد بی منہ کھولے حیران اسے دیکھ رہی تھیں اور اس کی ماں غصہ میں چلا رہی تھی۔

اگے ماٹھی ملے کیا گڑمہ بی کی آیا ہے۔ سیدھی بات بول نا...؟ تیری شادی کو چھ مہینے ہوئے بھول گیا.....؟

اماں چپ بیٹھ نا..... تو کیوں پکارا کر رہی ہے.....شابو اماں کی طرف دیکھ کر غصے میں چلا یا.....تب چیکٹ پلی کے خاجو میاں نے جھک کر کنکول کے رامیا سے تلگو میں کہا۔

ان دونوں کی رسم وینکٹ ریڈی کے قتل سے پہلے ہو گئی تھی۔ اور یہ پوٹی سارا دن گھر

سے غائب رہا کرتی تھی۔ حرام زادوں نے جبھی سے چھپ کر ملنا شروع کر دیا ہوگا۔ مگر اب نکاح ہو گیا ہے۔ اس لئے شابوہا  
 ”سے اپنا ہی بچہ بول رہا ہے۔“

اور خاجومیہ کی بات پر سب قہقہہ مار کے ہنس پڑے۔ جب بات اتنی ہلکی ہو جائے کہ قہقہوں میں اڑائی جائے تو  
 پنچوں نے اب کچھ کہنا سننا بیکار سمجھا۔ دونوں فریقوں کی طرف سے منگوائی ہوئی سیندھی، کلیجی کے کباب اور تیز مرچوں  
 والے سیو دال کھاتے ہیں، انہوں نے فیصلہ کیا کہ بچہ شابوہا کا ہے، اس لئے شابوہا بچے اور خواجہ بی کے ساتھ گھر جاتے، اور  
 آئندہ بسم اللہ ہی بہو پر بد چلنی کا کوئی الزام نہ لگائے۔ مگر گھر آنے کے بعد شابوہا کی ماں غصہ کے مارے یوں اُچھل رہی تھی  
 جیسے گرم تیل میں پوری ناچ رہی ہو۔

سارے خاندان کی ناک کٹوادی، حرامی چھوکرے کو کلیجے سے لگا کر پنچائیت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

.....چپ بیٹھ بڈھی۔۔۔“ شابوہا سے چلایا

سارا دن کھیتوں میں کام کر کے میرا قرض اُتار رہی ہو وہ۔ تم سب کا پیٹ بھرتی ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ چھو کر  
 بڑا ہو کر مزدوری کرے گا۔ تو چاہتی ہے کہ چار محنت کرنے والے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ میں تو سابوکار کے پاس رہن پڑا ہوں۔  
 ’، ‘.....بھوکی مرے گی تو

بڈھی لا جواب ہوگئی..... ارے اُس نے بات کے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ عورت کی  
 عقل چولھے میں..... غریب کسانوں کے ہاں تو بچے ہی دولت ہیں جو کسی خرچ کے بغیر ہی پل جاتے ہیں۔ تین چار برس تک  
 وہ ماں کی جان کو جونک کی طرح چمٹے رہتے ہیں۔ پھر دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ چھینا جھپٹی کر کے سوکھی روٹی اور  
 باسی چاولوں سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ ان کے پیٹ بھر کے کھانے اور تن ڈھانکنے کی فکر کسی کو نہیں ہوتی۔ سات آٹھ برس کے  
 ہوتے ہی وہ ماں بہنوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ گوبر اُٹھانے، بھینسوں بکریوں کو جنگل لے جانے، جنگل  
 سے لکڑیاں توڑ لانے، مونگ پھلی اور ہلدی چننے کی مزدوری کرنے۔

جتنے بچے زیادہ ہوں اتنا ہی آسان کام ہوتا ہے۔ اب یہ بڑے لوگوں کے نخرے تو ہیں نہیں کہ آدمیوں کو گن کر کھانا پکا  
 لیں۔ چاول تو اتنے ہی پکیں گے۔ جتنے میسر ہوں، کم ہوں تو سب تھوڑا تھوڑا کھا کر سو جائیں گے۔ اسی لئے تو مستان پھانسی  
 پر چڑھنے سے پہلے احمد بی سے بولا تھا۔

تو کیوں گھبراتی ہے۔ آٹھ چھوکرے ہیں۔ تجھے تو سکھ کا جھولا جھلائیں گے۔ ہاں چھوکرے کی شادی جلدی کر ”  
 دینا۔“

خواجہ بی گھر آئی تو بسم اللہ ہی نے سوچا..... اس اُجاڑ صورت کو مار کے رہوں گی۔ اب اس نے اس کی پیٹھ پر  
 لات مارنے کی بجائے پیٹ پر لات مارنا شروع کی۔

بٹ چھنال.....میرے چولھے کنے نکو آو۔ تجھے کتے کی طرح دُور سے روٹی دوں گی۔“

اس دن کے بعد بسم اللہ ہی نے خواجہ بی اور اس کے بیٹے پاشو کو کبھی ایک سے زیادہ روٹی نہیں دی۔ ابھی پاشو سال  
 بھر کا بھی نہیں ہوا تھا کہ چھوٹو آ گیا۔ اور چھوٹو کے پیچھے پیچھے مٹا..... دو برس میں خواجہ بی تین بچوں کی ماں بن  
 گئی۔ شابوہا کی تو باچھیں کھلی جاتی تھیں

”بھری بھاگوان ہے رے میری عورت، دن بھر کھیتوں میں کام کر کے مزدوری بھی لاتی ہے۔“

مگر رات کو سیندھی کے نشہ میں دھت شابوہا کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خواجہ بی بھوکی ہے۔ اس کے بچے  
 بھوکے ہیں...وہ رات بھر بچوں کے ساتھ ساتھ خود بھی روتی ہے۔ صبح وہ پڑوسیوں سے باسی روٹی اور اچار مانگ کر لاتی۔  
 .....پڑوس کی عورتیں اس بچوں والی ماں پر ترس کھاتی تھیں۔ مگر بسم اللہ ہی سے چھپا کر دیتے۔ کیونکہ وہ بہت شور مچاتی

اُجاڑ صورت گاؤں میں مجھے بدنام کر رہی ہے کہ میں پیٹ بھر کھانا نہیں دیتی۔ اس بے وقوف شابو کو کیا ہوا ہے۔ وہ .....سارے گاؤں میں تجھے بدنام کر رہی ہے نا اجاڑ صورت

یہ سنتے ہی وہ غیرت مند مرد کا بچہ لاٹھی اٹھا کر خواجہ بی کو مارنا شروع کر دیتا ، آدھی رات کوچیخ و پکار سن کر محلے والے کہتے۔

زندہ دفن کر دے بسم اللہ بی..... تو اپنی بہو کو اتنا کیوں جلاتی ہے۔؟”

پھر خواجہ بی پر کشن کو رحم آنے لگا۔ کشن گاؤں کا ایک پاگل نوجوان تھا۔ اس کی بیوی کو کوئی تحصیلدار اُٹھا کر لے گیا تھا۔ اس کے بعد وہ پاگل ہو گیا۔ جہاں کسی شیروانی والے صاحب کو دیکھتا تو چلانے لگتا۔

چور.....چور.....مارو.....مارو.....ختم کر دو سالے کو۔“ اور پتھر”

اٹھا کر مارنے دوڑتا تھا..... کشن کی حالت پر سارے گاؤں والوں کو ترس آتا تھا۔ بچارہ کھیت گھر دار والا آدمی تھا۔ پاگل ہوا تو کھیتوں پر بھائیوں نے قبضہ کر لیا ، اور اسے کھانا دینے کی ذمہ داری سارے گاؤں نہ قبول کر لی۔ لوگ کہتے تھے، صبح سویرے کشن جس دروازے پر کھڑا ہوجائے وہاں برکت آتی ہے۔ اس لئے اس کی جھولی کھانے سے بھری رہتی تھی۔ صبح سویرے خواجہ بی کسی بہانے کشن کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ اور پھر کھیتوں کے کنارے کسی جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر اس کی جھولی کا کھانا کھا لیتی۔

مگر تھوڑے دنوں بعد ہی بسم اللہ بی کی چیل جیسی آنکھوں نے بہانپ لیا کہ کشن روز خواجہ بی کے ساتھ کھیتوں پر جاتا ہے اور اس کی آواز سنتے ہی خواجہ بی..... بے تاب کے ساتھ باہر بھاگتی ہے۔

آج بھی ساری رات خواجہ بی کی خالی آنٹیں جلتی رہی تھیں۔ پھر صبح سویرے کشن اپنی جھولی بھرے دروازے پر آیا تو خواجہ بی آنکھوں کو گوبر سے لپٹ رہی تھی بسم اللہ بی کوٹھری میں بیٹھی کنگھی کر رہی تھی۔ پاشو آنکھوں میں گولیا کھیل رہا تھا۔ شابو کھیتوں پر کام کرنے چلا گیا تھا۔ اور دونوں چھوٹے بچے اندر کوٹھری میں گوبر میں سنے چلا رہے تھے۔ موقع پا کر خواجہ کی چپکے سے باہر گئی... ابھی اس نے کشن کی جھولی میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ بسم اللہ بی کا زور دار مگہ اس کی پیٹھ پر پڑا۔

حرام زادی۔ اب اس پاگل چھوکرے سے دیدے لڑا رہی ہے...؟ چھپ چھپ کر اس سے ملتی ہے؟ میں سب دیکھ رہی ہوں تیرے تماشے... جا اپنی ماں کو بلا کر لا۔ آج تیرا فیصلہ کروں گی۔

بسم اللہ بی کے سخت ہاتھوں کی مار سے خواجہ بی کے ہونٹ زخمی ہو گئے اور اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ سانس اور شوہر کی مار کھا کر وہ کبھی کچھ نہ بولتی تھی۔ سسرال آنے کے بعد وہ ہمیشہ ہی گم سم رہتی تھی۔ مگر آج وہ دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر زور زور سے چلا نے لگی... تو نے مجھے بدچلن کہا .....مجھے بدنام کیا..... ٹھیر آج میں ...بھی تجھے مزہ چکھا دوں گی

اچھا... یہ آج میرے اوپر ہاتھ اٹھانے والی ہے! قاتل باپ کی اولاد ٹھہرو..... آج میں بھی اندر سے درانتی لاؤں گی..... اسے ابھی سیدھا کر دوں گی۔

بسم اللہ بی کو ٹھہری میں گئی... آس پاس محلے والے جمع ہو گئے... ماں کے رونے کی آواز سن کر تینوں بچے بھی ماں سے آ لپٹے اور رونے لگے۔

خواجہ بی نے غصہ میں اپنے کھلے بال لپیٹے اور دونوں بچوں کو گوڈر کی طرح سمیٹا دروازے پر پاشو ملا۔

اماں... اماں تو کہاں جارہی ہے...؟ وہ ٹانگوں سے لپیٹ گیا۔

ہٹ میرے سامنے سے نہیں تو تجھے بھی مار ڈالوں گی... اس کے منہ سے خون ٹپک کر پاشو کے سر پر گر پڑا۔

او ہو... آج اس کا زور دیکھو۔ اپنے بار کے ساتھ دن دھاڑے بھاگ رہی ہے... کمر پر ہاتھ رکھے بسم اللہ ہی نے سارے پڑوسیوں کو سنایا۔

سب نے دیکھا... آگے آگے دونوں بچوں کو سمیٹے خواجہ بی بھاگ رہی تھی۔ پیچھے پیچھے کشن... کھیتوں کے کنارے کشن نے اسے پکڑ لیا۔

”آگے کیوں بھاگ رہی آج کھانا تو کھالے۔“

نکو میرے کو تیرا کھانا۔ میں باولی میں گرنے جارہی ہوں۔ اس نے غصہ میں کشن کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

اچھا تو چلو..... کشن بڑے اطمینان سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اندھی بادلی تک آیا۔ خواجہ بی نے کاندھے سے چمٹی ہوئی بچی کو زبردستی چھڑایا اور جھپاک سے باولی میں پھینک دیا۔ جب بچی کے گرنے کی آواز آئی تو وہ دل تھام کے چلاتی۔

...اماں میری بچی..... اور پھر اس نے کنکول کی ہواؤں کو مخاطب کر کے کہا

ارے گاؤں والو! تمہارے پیٹ کو انگار لگو۔ کنکول والو۔ تمہاری سب بیٹیاں بھی میری طرح ڈوب کے مر جانے دو۔“ اور پھر وہ غڑ اپ سے بچے سمیت باولی میں کو دگنی۔

کشن بڑی دیر تک جھک کر ان کے ڈوبنے ابھرنے کا تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر جب باولی کا پانی ساکت ہو گیا تو وہ تیزی سے گاؤں کی طرف بھاگا۔

مر گئے..... مر گئے..... تینوں مر گئے..... اب اس کھانے کا کیا کروں..... لو تم سب کھا لو۔“ وہ سب کو جھولی میں سے نکال کر روٹیاں بانٹتے لگا۔

انتی دیر میں بیل ہانکتا ہوا، شابو گھر واپس آیا تو بسم اللہ ہی کی چیخوں سے سارا محلہ گونج رہا تھا۔

آخر بھاگ گئی ناوہ رائٹ، اس پاگل چھوکرے کے ساتھ میں تیرے کو بولی تھی کہ اس چھنال کو لات مار کے گھر سے نکال دے۔ ریڈیوں، کنبیوں کے ساتھ سو کر آتی ہے وہ... ابو اللہ انے میرے خاندان کے منہ پر کالک لگا دی نا... بس اللہ ہی بیچ آنگن میں بیٹھی سر پیٹ رہی تھی۔

شابو نے یہ سنا تو کونے میں پڑی درانتی اٹھانی اور دوڑا خواجہ بی کو مار ڈالنے کے لئے۔ مگر بہت سے لوگوں کو اندر آتے دیکھ کر رُک گیا..... وہ لوگ بڑی خاموشی کے ساتھ بندھی سے ایک کے بعد ایک لاش اُتار رہے تھے۔ انہوں نے تینوں لاشیں آنگن میں ڈال کر ان پر کپڑا ڈھانپ دیا... شابو نے حیران ہو کر ان لاشوں کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ سے درانتی چھوٹ گری۔ پھر وہ کلیجہ تھام کر انتی زور سے چلا یا کہ اس کی آواز گاؤں کے سارے پہاڑوں سے جاٹکرائی۔ پھر اس نے نیچے پڑی ہوئی درنتی اٹھا کر اپنے سر پر ماری اور لاشوں کے اوپر گر گیا...

بسم اللہ کی سر تھامے بیٹھی تھی..... بیٹھی رہی..... وہ اس صدمہ سے پاگل ہو گئی تھی..... چاروں جنازے گھر سے باہر نکلے تو خواجہ نبی کی نندوں نے گھر میں چراغ جلا دیا..... گھر وہ کسی طرح نہ جلا۔ گاؤں کے مولوی صاحب آئے۔ بھا نامتی کرنے والے جادوگر کو بلایا۔ مگر گھر میں کوئی چراغ نہ جلا سکا..... خواجہ بی کی جس نند کی شادی ہوئی وہ سسرال سے دھتکار کے میکے آبیٹھی..... اس سال کنکول میں بھیا تک سوکھا پڑا... گاؤں والے شہر میں بھیک مانگنے اور مزدوری کرنے بھاگے۔

گاؤں کے بڑے بوڑھے کہتے تھے یہ سب خواجہ بی کی بددعاؤں کا اثر ہے۔ اب گاؤں میں کوئی لڑکی سسرال جا کر... سسکی نہیں رہے گی۔ گاؤں والے ہمیشہ دانے دانے کو محتاج رہیں گے

اکیلا پاشو سارے گھر میں روتا پھرتا تھا۔ چار برس کی عمر میں اس نے چار موتیں دیکھی تھیں۔ اس لئے وہ ہر چیز سے ڈرتا تھا۔ چاروں طرف وہ گوڑ ڈھونڈتا پھرتا جس کی گرمی میں وہ منہ چھپا کر لیٹ جائے۔

پھر لاٹھی ٹیکتی گرتی پڑتی احمد بی کنکول آئی اور پاشو کی انگلی پکڑ کے اپنے ساتھ چیکٹ پلی لے گئی۔

وہاں مراد، نورآ، بی جانی، گوری بی اور سب بچے پاشو کو سینے سے لگا کر روتے۔ مگر سلیم دور کھڑا اسے دیکھتا رہا..... وہ مچھلی پکڑنے کے جال میں گل باندھ رہا تھا۔ باندھتا رہا۔ جیسے بہن بھائیوں اور بہنوں کے مرنے کی خبر اس نے سنی ہی نہ ہو۔ اس کی وہ خوبصورت نازک سی بہن، جو تیز دھوپ میں کام کرتے وقت سر پر ہاتھ رکھ لیتی تھی۔ ہمیشہ پھٹے کپڑے پہنے رہتی، سب بہن بھائیوں کے حکم مان لیتی۔ اس نے کبھی کسی بات پر احتجاج نہیں کیا۔ اپنے حصے کا کھانا بھائیوں کو کھلا لیتی تھی۔ وینکٹ ریڈی کو اس نے کبھی گالی نہیں دی۔ اپنے شوہر اور ساس کی مار کھا کے سر جھکا لیتی تھی۔ چھوٹے سے بچے کو کمر سے باندھے دن بھر کھیتوں پر مزدوری کرتی اور رات کو بھوکی سو جاتی۔ مگر اب اس میں اتنی جرأت کیسے آگئی کہ وہ بچوں سمیت باولی میں گر گئی..... اور سلیم ابھی تک بے غیرت بنا، مچھلیوں کے لئے جال بن رہا ہے، بھلا ہمارے جال میں بھی کوئی مچھلی پھنسے گی..... بس ساری عمر خواجہ بی کی طرح ہر طرف سے دھکے اور جوتے کھانا بے۔

ملیشم نے اسے اپنے گھر کے اندر آنے سے منع کر دیا تھا۔ باہر کے کاموں پر لگا دیا۔ مگر سلیم کا دل کہیں نہیں لگتا تھا۔ اس کے سب بہن بھائی صبح سویرے مزدوری پر چلے جاتے تھے۔

بی جانی اور گوری بی کو بھی احمد بی نے کھیت مزدوروں کو گھیر گھار کے نکاح پڑھوا دیا تھا..... اب وہ دونوں بھی اپنی اپنی سسرال میں شوہر اور ساس کی مار کھاتیں مزدوری کرتیں اور روز باولی میں ڈوبنے کے لئے بھاگتی تھیں۔ مراد دن رات ملیشم کے کام میں جٹا ہوا تھا۔ نورآ بھابی، گھر کا کام کرتی، بچے پالتی، پھر کھیتوں پر مزدوری کو بھی جاتی۔ دن بھر احمد بی اکیلی کھانسی جاتی۔ روتے روتے اب اس کی آنکھوں سے سجھائی نہیں دیتا تھا۔ محنت مزدوری نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ اب صرف سلیم کی ہو کر رہ گئی تھی۔ سلیم دن رات ماں کی خدمت میں لگا رہتا تھا..... گاؤں کے حکیم سے اس کے لئے دوا لاتا۔ اس کے پاؤں دباتا اور پھر اماں کے پاس گم سم بیٹھ جاتا تھا۔ احمد بی کو کم نظر آتا تھا مگر پھر بھی وہ جیسے سلیم کے..... دل کا دکھ اس کے چہرے پر پڑھ لیتی تھی

تو رتنا کے گھر کیوں نہیں جاتا؟ اس کے ہاں خوب باسی کھانا بچتا ہے۔ سب کا پیٹ ”

”بھرتا تھا..... تو جا کر دیکھ، رتنا تیری راہ دیکھ رہی ہوگی۔

رتنا میری راہ دیکھ رہی ہوگی! اس گھر میں ایسا کونسا کام ہے جو ملیشم نہیں کر سکتا۔ وہ تو اب وینکٹ ریڈی کی ”مسہری پر سوتا ہے۔ پھر رتنا کیوں میری راہ دیکھے گی۔

ایک دن سلیم آنگن میں بیٹھا بیلوں کے لئے گھانس کاٹ رہا تھا۔ رتنا دالان کے ایک کونے میں سفید ساری سے سر ڈھانپے چاول صاف کر رہی تھی۔ پھر ملیشم اندر آیا اور بڑے پیار سے اُردو میں بولا۔

”بھابی... جان... کھانا دو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔

مگر رتنا سر جھکائے چاول صاف کرتی رہی۔ جیسے اس نے کچھ نہیں سنا۔ جیسے وہ کسی کی بھابی ہو نہ جان..... تب گھبرا کے پوشما اٹھ بیٹھی اور ملیشم کی بیوی کو پکارنے لگی۔

”راج لکشمی... ادھر آ... اپنے پتی کو کھانا دے۔“

ڈری سہمی سہمی سی راج لکشمی تھالی لئے چولہے کئے سے آئی۔ پوشما کے پاس چوکی بچھا کر

تھالی رکھ دی۔

ملیشم کو نہ جانے کس بات پر غصہ آیا۔ اس نے پہلے تو دال کی کٹوری اٹھا کر دور پٹک دی، اور پھر زور سے گلاس زمین پر رکھ کر بولا۔

‘ ‘..... سارے گاؤں والے ہم سے خفا ہیں ماں”

”کیوں بیٹھے... اب ہمارے پاس کیا رہا ہے جو وہ ہم سے خفا ہیں۔“

سلیم کھٹا کھٹا گھانس کاٹ رہا تھا درانتی سے۔ مگر اس کے کان دالان کی باتوں پر لگے

ہوئے تھے۔

پوشما گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ جیسے گاؤں والوں کی ناراضگی وہ برداشت نہیں کر سکتی۔

وہی وینکٹی انا نے جو کچھ کیا ہے... سنا ہے سرتاج کی ماں نے تو عدالت میں یہ بیان دیا ہے کہ وینکٹ ریڈی نے ”مسلمان ہو کر سرتاج سے نکاح کیا تھا۔ اس لئے وہ جائیداد میں سے حصہ مانگے گی اب۔“

ملیشم ماں سے باتیں کرنے میں کن انکھیوں سے رتنا کی طرف دیکھ رہا تھا، جو اپنے سیاہ بالوں کو سفید ساری کے پلو سے چھپائے، جلدی جلدی چاولوں میں سے کنکر نکال رہی تھی۔ پھر اس کے ہاتھ رُک گئے۔ اور دو چپ چاپ سامنے زمین پر کچھ دیکھنے لگی۔

تم جوتے کیوں نہیں مارتے، اس رنڈی کی ماں کو.....؟ پو شماغضہ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ارے میرا بیٹا تو جاگیرداروں سے بھی بڑا تھا..... جس کے پاس دھن دولت ہو وہ ہزار رنڈیوں کے پاس جائے ”گا..... ہونہ وہ دو ٹکے کی چھو کری..... بھلا

‘ ‘..... وینکٹی کیوں کرنے لگا اس سے نکاح۔ ان کمینوں کی ہمت تو دیکھو

ہمت کی کیا بات کر رہی ہو ماں... ملیشم نے رکابی سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور رتنا کی طرف

دیکھ کر آہستہ سے بولا۔

عورت کی عزت سے کھیلنا مذاق نہیں ہے۔ تمہیں کیا معلوم وینکٹی انا کہاں کہاں جاتے تھے۔ اس گاؤں کی کتنی کنواری لڑکیوں کو انہوں نے... اور پھر سامنے سلیم کو بیٹھا دیکھ کر چپ ہو گیا۔

ملیشم انا، چپ رہو نا..... رتنا نے بے بسی سے چلا کر کہا اور گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ شادی کے دس برسوں میں وینکٹی نے اسے کتنی راتیں دیں..... کتنا پیار دیا۔ ہر دن کام..... ہر وقت مصروفیت..... رتنا اکیلی اس اندھیرے کمروں والے گھر میں ڈولتی پھرتی تھی۔ کبھی کبھی روٹھ جاتی۔ پھر خوب بناؤ سنگھار کرتی کہ سلیم اسے منہ پھاڑے دیکھے جاتا تھا۔ وہ شرما کے سلیم کو ڈانٹ دیتی..... اس کی نظریں ہر طرف وینکٹی کو ڈھونڈتی تھیں۔ پھر وہ اسے باہر... بیٹھک میں مل جاتا..... کسی چھوٹی سی لڑکی کے ساتھ

تو مردانے بیٹھک میں کیوں آئی...؟ وہ الٹا رتنا پر برس پڑتا۔ روتی ہوئی رتنا اپنے کمرے میں آکر نئی ساری کھول کے پھینک دیتی۔ ماتھے کا سرخ بٹو مٹا دیتی۔ سارے گہنے، پھولوں کی بینی نوچ کر پیروں سے روند ڈالتی تھی۔

رات کو شہر کی مہنگی شراب میں ڈوبا۔ طلب کی آگ میں بھڑکتا ہوا وینکٹی اس کے پاس آتا تو ہو دبکا دے کر دُور ہٹ جاتی..... اور وینکٹی سوچتا..... کیسی بد مزاج بیوی ملی ہے اسے۔ سالی کبھی ہنس کر بات ہی نہیں کرتی۔ میں نے گھر..... میں کونسا سکھ نہیں دیا اسے..... مہارانی بنا کر رکھا ہے۔ مگر بے نا بھکاریوں کی اولاد..... آخ تھو

مستان..... ابے مستان، گھوڑا نکال..... سرتاج کے پاس جاؤں گا۔

..... اب چپ رہو بھائی..... مجھ سے تمہارا ہر وقت کا رونا نہیں دیکھا جاتا

ملیشم اٹھ کر رتنا کے پاس آیا اور اپنے رومال سے اُس کے آنسو..... پونچھنے لگا... رتنا کو

روتے دیکھ کر، سلیم کے ہاتھ بھی کانپ گئے۔ وہ جلدی سے اٹھا۔ پھر بیٹھ گیا..... کہاں جاؤں!..... کدھر دیکھوں.....؟



عورتوں کے چکر نے وینکٹی انا کے جان لے لی.....مگر میں جو ہوں... میں تمہیں اپنے ساتھ شہر لے جاؤں ”  
گا..... بچوں و اچھے اسکول میں داخل کروں گا تم فکر کیوں

‘ ‘ .....کرتی ہو

نہیں نہیں..... رتنما کو شہر مت لے جاؤ.....“ اچانک بے اختیار سلیم

چلانے لگا۔

ملیشم نے پلٹ کر سلیم کو دیکھا..... وہ آہستہ سے سلیم کے پاس گیا..... اس کا کان پکڑ کے اٹھایا ، اور پھر دروازے کی طرف لات مار کے ڈھکیل دیا۔

“اب دبلیز پر کبھی قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ ڈالوں گا..... سال.....حرام خور۔”

رتنما گھبرا کے انہی ملیشم کے پیچھے پیچھے آنگن تک آئی..... اور پھر دالان کی طرف لوٹ گئی..... دروازے سے باہر جاتے ہوئے سلیم نے دیکھا ، رتنما اسے بڑی بے بسی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

رتنما کے گھر سے نکلنے کے بعد سلیم نے تیرے میرے کھیتوں پر کام کیا۔ مراد کا بوجھ ہلکا کرنے اس کے ساتھ ملیشم کے کھیتوں کا کام کرنے گیا۔ مگر اس کا جی کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ جی چاہتا چیکنٹ پلی کی اونچی اونچی چٹانوں کو توڑ پھینکے۔ سارے کچے آم توڑ ڈالے۔ پوچما کے دیول میں جا کر پوچھے۔

بس تمہیں صرف دیدے چمکا کر ڈرانا آتا ہے؟ اس کو مار ڈالے جو ابھی تک اس کے سر پر سے کانٹیں کانٹیں کر ”  
کے اڑا کرتا ہے۔

سنا ہے رامیا تو تلنگانہ کے چھاپہ مار دستے ( دلم ) میں جا ملا ہے۔ سارے گاؤں میں یہ بات مشہور تھی۔ میں بھی ان لوگوں کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ سلیم غصہ کے مارے راہ چلتے میں آنے والے پتھر کو ٹھوکریں مارتا چلتا ہے۔

ملیشم نے نرسیا اور اس کے خاندان پر کڑی نگرانی رکھی تھی۔ گاؤں میں کوئی نیا آدمی آتا تو ملیشم اسے غور سے دیکھتا تھا۔ پولیس پٹیل فوراً انکوائری کے لئے جاتا۔ پھر جب دلاور علی خاں کی کھڑی فصل آپی آپ رات کو جل اٹھی۔ پولیس پٹیل

کے بیل کھونٹے سے بندھے غائب ہو گئے تو ایک دن حیدر آباد سے پولیس کی دوڑ آئی۔ اور انسپکٹر صاحب نے کھیتوں میں کام کرنے والے دو لمباڑوں کو اور ایک عورت کو پکڑ کے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ چاول کی فصل ان کے خون میں دوب گئی۔ سنا ہے شہر کے ہاسپٹل لے جاتے وقت ہی وہ تینوں ختم ہو گئے تھے۔

اتوار کے دن ”صحیفہ“ اخبار شہر سے آیا تو سلیم نے بس اسٹاپ پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو ایک خبر سنائی۔

موضع چیکٹ پلی میں چھاپہ ماروں کے ایک جتھے نے پولیس پارٹی پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں پولیس نے بڑی دلیری سے ان کا مقابلہ کیا۔ تین غنڈے مارے گئے جن کے پاس کثیر مقدار

میں اسلحہ تھا۔

واپسی میں ان پولیس والوں کی ملیش نے بڑی زور دار دعوت کی تھی۔ رامیا کے آنگن میں چگنے والی مرغی کو جب مراد نے ذبح کرنے کے لئے پکڑا تو اس کے پیچھے پیچھے پھرنے والے ننھے ننھے چوزے خوب روئے چلا ہے۔ سارے آنگن میں ماں کے پروں کا سایہ

ڈھونکتے پھرتے۔

سلیم کو ظہیر آباد جا کر سائیکل پر ولایتی شراب لانا پڑی۔ خیر اس بہانے اس نے ظہیر آباد تو دیکھ لیا... وہ ریل کی پٹریاں دیکھنے اسٹیشن گیا۔ ریل تو کوئی نظر نہیں آئی۔ مگر دُور تک جاتی ہوئی پٹریوں کو اس نے غور سے دیکھا، جن کا دوسرا سرا حیدر آباد سے ملتا ہے... اب بستی بستی گھومنے والے بنجاروں پر بھی پابندی لگ گئی کہ وہ گاؤں کے اندر نہ آئیں... بس اسٹاپ پر بیٹھنے والے چھوکروں کو بھی ایک دن پنتلوںے خوب جھاڑا۔

تم لوگوں کو کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ شہر کے غنڈوں سے بری باتیں سننے کیوں یہاں روز آکر بیٹھتے ہو۔ خبردار جو ”میں نے کل یہاں کسی کو بیٹھتے دیکھا۔ ٹانگیں توڑ ڈالوں گا۔“

سب لڑکے پنتلو کی ڈانٹ سن کر بھاگے۔ اس دن سے بس کا وقت ہوتا تھا تو پہلو ضرور لنگڑاتا ہوا ایک چکر لگاتا تھا۔ صرف یہ دیکھنے کہ شرفوں کی ٹوٹی بنج پر کون کون بیٹھا ہے۔ اور کیا کیا باتیں ہو رہی ہیں... پنتلو کو دیکھتے ہی سلیم منہ کے سامنے اخبار پھیلا کر زور زور سے اعلیٰ حضرت کا فرمانِ مبارک پڑھنے لگتا تھا۔

فرمایا... ”وہ یہ تھا کہ آجکل نذری باغ میں انتظام پخت پز ابتر ہوتا جا رہا ہے۔ ٹمائر کا سالن بھی گوگڑا ہوتا ہے... ہر چند کہ...“ فرمانِ مبارک سننے کے لیے پنتلو کے پاؤں تھم جاتے تھے۔ ادب سے سر جھک جاتا، وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔

اماوس کی رات تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔

آج گاؤں میں پوجمّا کی پوجا نکلنے والی تھی۔ جب گاؤں میں چیچک ، طاعون یا بیضہ پھیلنا تھا لوگ سمجھ جاتے کہ کالی ماتا ناراض ہے۔ پوجمّا کے قہر سے سب ہندو مسلمان ڈرتے تھے۔ اس لئے گھر گھر سے پیسے اکٹھے کئے جاتے۔ پوجمّا کے دیول کا پجاری جس پر دیوی کا سایہ ہوتا ہے، صبح سے کھیلنا شروع کر دیتا تھا۔ آدھی رات کو قربانی کا بھینسہ آتا۔ صدقے کا سامان ایک کورے گھڑے میں رکھتے اس کے پیچھے سات پجاری ننگ دھڑنگ ، ہاتھوں میں نیم کی شاخیں تھا مے، دیوی کی جنے کار کے نعرے اتنی زور زور سے لگاتے کہ پورا گاؤں گونج اٹھتا۔ اس کے ساتھ بڑی خوفناک دھن میں دھبڑا اور سنکھ بجاتے۔ مجال ہے کہ اس وقت کوئی گھر سے باہر نکلے۔ کہتے ہیں اس پوجا کی راہ کاٹنے والے پر رات بھاری ہوتی ہے۔

اس لئے احمدّ بی اور نورآ نے آج سرشام بچوں کو کھلا پلا کر سلا دیا تھا۔ پورے گاؤں میں سنائٹا چھا گیا۔ مگر مرادّ اور سلیم کی باتیں ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ سلیم کہ رہا تھا کہ وہ اب گاؤں سے چلا جائے گا۔ اور مرادّ سے روکنے کی کتنی ترکیبیں کر رہا تھا۔

کبھی غصہ کرتا، کبھی پیار سے سمجھا تا۔ دونوں بھائی بکریوں کے ٹوٹے چھپرے تلے بیٹھے

کھسر پھسر کر رہے تھے۔ احمدّ بی چلا چلا کر بار گئی کہ کھانا کھالو۔ پھر باتیں کرنا۔ نورآ جب بھی کھانے کی رکابیاں لے کر وہاں گئی مرادّ نے جھڑک دیا۔

آج تو پورے گاؤں کا مول چکا کر اٹھینگے۔ احمدّ بی نے جل کر سوچا اور کروٹ بدل کر سو گئی۔

ہندوستان آزاد ہو گیا۔ یہ خبر پورے چیکٹ پلی میں پھیلی تو ہر طرف اُجالا سا پھیل گیا۔ ”چلو اب کسی کی غلامی نہیں کریں گے۔ اب ہم آزاد ہیں۔۔۔“ سلیم نے اخبار ”صحیفہ“ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی تقریریں پڑھیں۔

اب ہم آزاد ہیں۔۔۔“ سلیم نے اخبار پھینک کر خوشی سے چاروں طرف دیکھا۔

سارے گاؤں میں ہر طرف خوشیاں منائی جارہی تھیں۔

اب ہم آزاد ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

مراد بھائی۔۔۔ اب تو سابوکار ہم لوگوں کو بھی آزاد کر دے گا۔ باوا کا قرض تو اب معاف ہو جائے گا؟“ رات کو سب ”کھانے بیٹھے تو سلیم نے مراد سے پوچھا۔

مگر صابر میاں بول رہے تھے ، ہم تو اعلیٰ حضرت کی رعایا ہیں۔ ہم لوگ کتے کانگریس کی غلامی کیوں کرنا۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ سلیم کا ٹھابوا ہاتھ نیچے گر گیا۔

تو کیا اعلیٰ حضرت اپنی رعایا کو آزاد نہیں کریں گے۔“؟ احمد بی سب کو سالن دیتے میں پوچھا۔

”کیا معلوم۔۔۔۔۔ اب دیکھنا ہے کیا ہوتا کی۔“

لو۔۔۔ دیکھو۔۔۔ ایسی لوٹ مار، قیامت کا سماں۔۔۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ ایک طرف سے رضا کار آئے۔ ادھر کمیونسٹوں کی دھانیں دھانیں۔

پھر شور اٹھا۔ انڈین یونین کی فوجیں آ رہی ہیں۔

گھوں گھوں گھوں۔۔۔ گاؤں کے اوپر سے ہوائی جہاز چلاتے ہوئے گزرتے تھے تو اپنے گھروں میں چہپے ہوئے لوگ کانپ اٹھتے۔ اب ہم گرا۔

مگر سلیم بڑی پر اُمید نظروں سے ان ہوائی جہازوں کو دیکھتا تھا جیسے اس کا جی چاہتا تھا ایک ہم ملیشمن کے گھر پر گرے۔ ایک صابر میاں کی درگاہ پر۔ اور ان کی غلامی کے لکھے ہوئے سارے کاغذ جل جائیں۔ پورا گاؤں جل کر بھسم ہو جائے۔ پورا حیدر آباد اعلیٰ حضرت کی کنگ کوٹھی ، سب جل جائیں۔ انڈین یونین والوں نے پورے ہندوستان کو آزاد کروایا۔ وہ ہمیں بھی آزاد کریں۔ اپن جاکر پنڈت نہرو کو بولیں گے چیکٹ پلی والے تو انڈین یونین میں مل جائیں گے مگر سلیم کے کہنے سے پہلے جزل جے این چودھری خود اپنی فوجوں کے ساتھ حیدر آباد میں داخل ہو گئے۔

ہے ہے۔۔۔۔۔ سات پشتوں کے سلطنت آصفیہ ختم ہوگئی آج۔۔۔“ صابر میاں چھاتی پیٹ کر رور رہے تھے۔

اچھا ہوا امل۔ اپن بھی آزاد ہو گئے اب۔ ریڈی کی غلامی ختم۔ اب اپن جس کو ووٹ دیں گے ، ویچ اپنا پاشا بنیں گا۔ ان۔۔۔۔۔‘ ‘ ریڈیوں ، جاگیر داروں کو کوئی ووٹ نہیں دینا

جب گاؤں میں کانگریس والے ووٹ مانگنے آئے تو سب سے آگے سلیم تھا اس نے گھر گھر جا کر لوگوں کو سمجھایا کہ سابوکار کی غلامی نہیں کرنا ہے تو کانگریس کو ووٹ دو آخر وہی ہوا۔ چیکٹ پلی کے حلقے سے کانگریس امیدوار پدارپیڈ کامیاب ہوا۔ اس کی کامیابی کا جلوس نکلا تو لاری کے آگے ناچتے ناچتے سلیم تھک گیا۔

کانگریس زندہ باد۔ بولونہرو جی کی جئے۔

جئے جئے کار کے نعرے تھمے تو سلیم بس اسٹاپ پر بیٹھا روز شہر کا اخبار پڑھتا تھا۔ بار بار پدارپیڈ کے گھر کے چکر کاٹتا۔ اسے بڑا انتظار تھا کہ اب کس دن کسانوں کو غلامی سے آزاد کرنے کا اعلان ہوگا۔ رہن پڑے ہوئے کھیت واپس ملیں گے۔ عورتوں کی عزت لوٹنے والوں کو جیل بھیجا جائے گا۔

مگر پداریڈی کو یہ باتیں سننے کی فرصت ہی نہ تھی۔ وہ اب منسٹر بننے کی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ اس لئے اسے اپنے گاؤں آنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔

کسانوں کے لئے نیا قانون آیا ہے کیا.....؟

ایک دن سلیم نے بس ٹرائیور سے پوچھا۔

ارے غریبوں کے لئے بھی کوئی نیا قانون بنتا ہے رے۔ اپنی قسمت میں تو محنت کرنی ہی لکھا ہے۔ انگریز جاؤ کہ نہرو آؤ۔ وہی کام کر کے پیٹ بھرتا ہے

‘ ‘ ...ہونہ... تو یہ بات ہے ”

سلیم اکڑوں بیٹھا دونوں ہاتھوں میں سر تھامے۔ دُور سے شہر کو جانے والی سڑک پر اڑتی ہوئی ڈھول دیکھنے لگا۔

لو.....انگریز تو ہندوستان کی قسمت نہرو کے ہاتھ میں سونپ کر چلے گئے۔ اب ہم کیا کریں گے.....“ تھکی باری ”  
آپا پندرہ ا گسٹ کا رہبر کن پڑھ رہی تھیں بولی، تھکی باری آپا کا بدن ہائی بلڈ پریشر سے لرز رہا تھا۔ وہ سب بہت دن بعد زخمی  
پاؤں تھکے ہوئے زخموں سے چور بدن لئے ، اس پہاڑی کی آڑ میں ملے تھے۔

تم لوگ کیا سوچ رہے ہو.....؟“ آپا نے اخبار رکھ کر گم سم بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔“

ہم لوگ یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ اتحاد المسلمین کے ساتھ اب انڈین یونین کے گدھ بھی ہماری بوٹیاں نوچ ڈالیں  
گے۔

( آپا کے سر کی قیمت پانچ ہزار روپے تھی )

ملیشم ریڈی گاؤں میں بہت بڑا فساد کروانے والا ہے۔ اس کے لئے وہ شہر سے دس تھری ناٹ تھری بندوقیں منگوا رہا  
ہے۔ ان میں کم سے کم پانچ بندوقیں ہمیں ملنا چاہئیں۔ یہ بندوقیں ۷ تاریخ کی رات بندڈی میں رکھ کر ملیشم ریڈی کے گھر پہنچائی  
جائیں گی۔

عباس علی نے چٹھی کھول کر پڑھی۔

مگر چیکٹ پلی جانے گا کون..... ملیشم کے گھر میں کوئی گاؤں والا قدم نہیں رکھ سکتا سوائے سلیم کے.....  
لنگڑے خاجو کے بھائی یوسف نے کہا جو دھنگروں کی طرح بڑا سا شملہ باندھے کالا کمبل کاندھے پر ڈالے بیٹا تھا

‘ ‘ جیکٹ پلی میں جاؤں گا۔“ نر سیانے اپنے زخمی پاؤں پر میلی پٹی باندھتے میں کہا

تم ؟“ آپا نے اسے گھور کے دیکھا۔“

اپنے گاؤں جا کر کیا ہم سب کو پکڑوانا چاہتے ہو۔ تمہیں سب پہچان لیں گے۔“ ”نہیں... مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔“  
میں لنگڑا بڈھا ہوں گا۔ اور تم اندھی بڈھی۔“ اوبنگار ماں (سونے کی مورت جیسی اماں) کچھ ہمیں دیتی جا۔ بھگوان تیرے بچھڑے  
ہوؤں کو تجھ سے ملائے۔

تیری عزت آبر و سلامت رہے۔

رنگی صبح سویرے ریڈی کے کھیتوں پر کام کرنے نکلی تو اپنے گھر کے سامنے نیم کے پیڑ تلے دو بڈھے بھکاری  
بیٹھے نظر آئے۔ جانے کون سے گاؤں سے چل کر یہ دونوں اس جگہ آئے ہیں۔ یہاں انہیں روٹی کون دے گا۔ انہیں معلوم نہیں کہ  
اس سال گاؤں میں کیسی ہائے ہائے مچی ہے۔

تیرا پیٹ ٹھنڈا رہے اماں کچھ بوڑھے بھکاریوں کو دیتی جا۔ رنگی کو یوں لگا جیسے بوڑھے بھکاری کی نظریں اس  
کے اٹھتے پاؤں میں الجھ رہی ہیں۔

آج رات نرسایور کے پل کے نیچے مجھ سے ملو“..... نرسیا۔ ”

جس جیب میں نرسیا کا خط پڑا تھا۔ وہ بری طرح دھڑک رہی تھی۔ سلیم کی سمجھ نہیں آیا کہ کیا کرے! سنا ہے نرسیا تو چھاپہ مار دستے ”دلم“ میں مل گیا ہے سارے گاؤں میں یہ بات مشہور تھی۔ اسی لئے ملیشمن ریڈی نے نرسیا کے گھر والوں پر کڑی نگرانی رکھی تھی۔ بستی بستی گھومنے والے بنجاروں پر بھی پابندی لگ گئی کہ وہ گاؤں کے اندر نہ آئیں۔

بچوں کے بیچ بیٹھا مراد بار بار دیکھ رہا تھا کہ سلیم آج بہت بے قرار ہے۔ شاید رتنا کے گھر جانا چاہتا ہے۔ یا پھر ملیشمن نے اسے گالیاں دی ہیں۔

مراد کا دل دھڑک رہا تھا۔ باوا والی درانتی کہاں ہے؟ یہ بڑا سر پھر الونڈا ہے۔ ہر وقت

مارنے کو تیار۔

سلیم اندر کوٹھری میں گیا..... پھر باہر آیا..... اس نے چولہے کنے جا کر مچان پر سے ایک خالی تھیلا لیا..... مراد نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ رُک رُک جاتا۔ جب رات گہری ہوگئی تو سلیم آہستہ اٹھا۔

مراد اپنے بچھونے پر منہ لیپٹے لیٹا، اسے دیکھ رہا تھا..... سلیم نے رومال سر سے ہر باندھا..... تھیلا کاندھے پر رکھا اور باہر چلا گیا۔ مراد بھی اٹھا یہ دیکھنے کہ سلیم کہاں جا رہا ہے..... مگر اماوس کی کالی رات اسے نگل چکی تھی۔

دو دن بعد سلیم واپس آیا تو اس کے سر پر ایک بہت بڑی گٹھڑی تھی۔

مراد اور احمد بی گھبرا کے اس صورت دیکھ رہے تھے۔

تو کہاں چلا گیا تھارے۔ ہم نے سارے گاؤں میں تجھے ڈھونڈا۔ ریڈی بھی غصہ کر رہا تھا۔..... مراد نے اسے غور ”سے دیکھا..... سلیم بے حد تھکا ہوا تھا۔ نڈھال سا..... جیسے بے شمار پہاڑ کاٹ کر آیا ہو۔

“ریڈی کے کام سے گیا تھا..... اس میں سب سرکاری سامان ہے اماں۔ خبر دار جس کسی نے ہاتھ لگا یا۔“

ریڈی کے کام سے گیا تھا..... مراد خوش ہو گیا..... سرکاری سامان لانے تو سمجھ ریڈی ہم پر مہربان ہے..... سلیم سے اس کی ناراضگی ختم ہوگئی۔ اب پھر سلیم اس کے گھر جانے لگے گا۔ ریڈی کے گھر کا بچا ہوا کھانا گھر آیا کرے گا۔

سلیم اندر جا کر اماں کے پاس لیٹ گیا اور اماں کی چھاتی میں سر چھپا کر انکھیں بند کر لیں۔

بہت تھک گیا..... کیا کام تھا جو مجھے بتائے بغیر چلا گیا.....“ اماں نے اس کے میلے ڈھول بھرے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

اماں، اب مجھے بہت کام کرنا ہے...“ سلیم نے اماں کی ساری میں منہ چھپا کر کہا۔

مگر ایک بات سن لے۔ تو کسی بات سے ڈرنا نہیں۔ مراد بھائی کو بھی سمجھادے کیا پتہ ہمارے اوپر کوئی آفت ”آجائے۔“

اگے میری اماں۔ ہم کسی کا کیا بگاڑے بیٹا جو ہمارے اوپر آفت آئیں گی۔“ احمد بی گھبرا گئی۔

ہم کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے، اسی لئے تو سب ہمیں ستاتے ہیں۔ اب پتہ چلے گا سالوں کو..... حرام خوروں ”کو.....“ سلیم نے غصہ میں دانت پیسے اور جوش کے مارے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔



کڑا کے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ کھیتوں میں گئے اور جوار کی فصلیں تیار ہو چکی تھیں۔ جب کچے گنے میں رس پڑ رہا تو سارے گاؤں کی نیندوں میں مٹھاس گھل جاتی ہے۔ کنوارے لڑکے لڑکیوں کو رنگیں خواب نظر آتے ہیں۔ بوڑھے اطمینان اور فراغت سے لیٹ جاتے ہیں۔ اور بچوں والی مائیں اچھے دنوں کو سامنے دیکھ کر سوتے ہوئے شوہروں سے لیٹ جاتی ہیں خوشی کے مارے

سر شام گلابی جاڑوں کی چاندنی میں پاس پڑوسی گھروں کے سامنے بنی منڈیروں پر آبیٹھتے۔ کسی کے ہاں شادی کی تاریخ طے ہوتی۔ کہیں نئے چھپر ڈالنے کی باتیں ہوتیں۔ لڑکوں کے ختنے۔ گیارہویں کی نیاز۔ یوسف بابا کی درگاہ، والی منت..... کتنے خرچ تھے جو رنگیں تتلیوں کی طرح آنکھوں کے سامنے جھملا رہے تھے

آدھی رات کو احمد بی کی آنکھ کھلی تو اسے گڑ جلنے کی میٹھی میٹھی بو آنے لگی۔ میں تو خواب میں بھی گڑ کی خوشبو سونگھنے لگی ہوں۔ اس نے جھنجلا کر کروٹ بدلی اور ہاتھ بڑھا کر سلیم کوٹھولا۔

سلیم بچھونے سے غائب تھا۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھیں۔

اماں اماں کیا جل رہا ہے.....؟“ مراد نے گہری نیند میں آنکھیں کھول کر پوچھا ..... بس اسے تو ہر وقت کچھ نہ ”.....کچھ جلتا ہی نظر آتا ہے

نوراً کو غصہ آرہا تھا۔ مگر وہ سو نہ سکی۔ بہت دُور کہیں لوگوں کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں..... کسی کو مٹی کے گھر ڈاکہ پڑا ہے..... یا کوئی اچانک مر گیا ہے... کسی کا قتل ہوا ہے..... بس ان تینوں میں سے کوئی ایک وجہ ہوتی ہے کہ آدھی رات کو لوگ چلاتے ہیں۔

احمد بی اور نوراً گھبرا کے اٹھ بیٹھیں۔

سلیم آگے او سلیم..... اتنی رات کو کہاں چلا گیا رے یہ پوٹا..... یہ گڑ بڑ کیا ہو رہی ہے.....؟“ لیکن، سلیم ” ! .....ہوتا تو جواب دیتا

ا گے اماں خوب دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ ارے کسی کے ملوں (کھیتوں) میں آگ لگی ہے شاید.....“ نوراً آنگن میں کھڑے ” ہو کر کہا۔

پندرہویں رات کے چاند والے روشن دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا ، اور ہر طرف گڑ جھانے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ذرا دیر میں سارا گاؤں جاگ پڑا۔ سب چیختے چلاتے کھیتوں کی طرف بھاگے۔ سب سے آخر میں احمد بی اٹھی..... بری خبر تو اس کی کمرہ ہی توڑ دیتی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی تو تیزی سے اندر آتا ہوا سلیم اس سے ٹکرایا.....“ تو کہاں چلا گیا تھارے... آگ کہاں لگی ہے؟“ احمد بی نے گھبرا کے پوچھا

کیا خواب دیکھ رہی ہے اماں..... میں تو گھر میں ہی سو رہا تھا..... مجھے کیا معلوم آگ کہاں لگی ہے.....“ وہ ” بورنیے پر لیٹ گیا اور چادر اوڑھ لی.....“ تو پھر آگ بجھانے کیوں نہیں جاتا۔ اٹھ نا۔ سب چلے گئے۔“ احمد بی نے اسے جھنجھوڑا۔

مجھے بہت نیند آرہی ہے وہ منہ ڈھانپ کر سو گیا“

.....مگر صبح سویرے ملیگا کی لات، سلیم کے منہ پر پڑی تو وہ بڑ بڑا کے اٹھ بیٹھا

”چل بیٹا اُٹھ ریڈی بلا رہا ہے..... سالا آگ لگا کے مزے میں سو رہا ہے۔“

مراد اور احمد بی چلاتے رہے مگر وہ سب سلیم کو مرے ہوئے جانور کی طرح گھسیٹتے ہوئے

لے گئے۔ پیچھے پیچھے نوراً، بی جانی، مراد اور احمد بی روتے ہوئے بھاگے۔

”بھاگو یہاں سے۔ خبر دار جو کوئی ریڈی کے گھر آیا۔“

ملیگائے سڑاپ سڑاپ لاثہیاں مار کے سب کو بھگا دیا۔

پھر جب اپنے گھر کے سامنے نیم کے پیڑ سے اُلٹاٹکا کے ملیشمن نے اپنے جوتے کی نوک سے مارنا شروع کیا تو وہ چلاتا رہا۔

”میں نے آگ نہیں لگائی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون لوگ تھے۔“

ٹھہرو..... یہ یوں نہیں مانے گا..... ایک سلاخ گرم کے کے لاؤ۔ اس کی لنگی اُتارو.....“ ملیشَم نے چلا کر کہا۔“

“تلوار چلانا سیکھ رہے ہیں سالے۔ آج مزہ چکھا دیا میں نے انہیں۔“

کھیتوں میں آگ کس نے لگائی تھی.....‘...‘ ملیشَم کی بیٹھک میں شام ریڈی نے پوچھا۔“

“وہ تو وہی دلم (چھاپہ مار دستے) والے ہوں گے۔ مگر یہ مسلمان لونڈے بھی اب بہت اُٹھا رہے ہیں۔“

شام کو خون میں نہایا ہوا سلیم گھر آیا۔ سب اُسے لاش کی طرح اُٹھا کر دالان میں ڈال گئے۔ سب سے زیادہ زخم اس کے منہ پر لگے تھے۔ ایک دانت ٹوٹ گیا۔ گھٹنے زخمی ہو گئے۔ احمد بی اور سب گھر والے اسے دیکھ کر رونے لگے۔ مگر ریڈی کے خلاف کچھ کہنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اب۔ یہ سب اللہ کی مصلحت ہے۔

مراد تو ڈر کے مارے گھر میں آئے ہوئے لوگوں کے سامنے سلیم ہی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس کا چچا ابو خاں سر پکڑے بیٹھا تھا۔

“یہ پوٹا تو ہمیں جینے نہیں دے گا اب۔ اماں اسے نانی کے گاؤں بھجوا دو۔“

میں خود اب شہر جا رہا ہوں۔ کون رہے گا، اس اجاڑ گاؤں میں“..... سلیم نے زخموں سے کراہتے ہوئے کہا۔“

کیا.....؟ شہر جائے گا تو.....؟ کیا اتنی مار کافی نہیں ہوئی تجھے؟ اور ریڈی کے گھر کام کون کرے گا.....؟“

ابو خاں نے حیران ہو کر پوچھا۔

تو کر..... کیا باوا کے بدلے پورا گھر اس سالے کی غلامی کرنا۔“ غصہ کے مارے سلیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔“

اماں، اسے کیا ہو گیا ہے.....؟“ مراد نے بے بسی سے ماں کو دیکھا۔“

ابے نرسیا کا حشر دیکھ لیا نا۔ اور آج تیرا کیا حال ہوا۔ کیا تو بھی منہ کالا کر کے گدھے پر بیٹھنا چاہتا ہے اب.....؟“

مراد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس خود سر لونڈے کو کیسے سمجھائے۔

کون آئے گا اس گاؤں میں تھوکنے، جو منہ کالا ہوگا۔ وقار آباد کا بس ڈلیور بولا کتے،

“واں لاری کے کلینر کو (۲۵) روپے تنخواہ ملتی ہے۔ کھانا الگ۔ میں ہر مہینے (۱۵) روپے گھر بھیج دیا کروں گا۔

‘ ‘ اور تیرے بدلے یہاں ریڈی کی مزدوری کون کرے گا.....؟“

“..... ارے جا..... بھوت سہے ریڈی کی دھونس۔ تو سب کو لے کر شہر آجانا“

تیرا دماغ تو نہیں پھر گیا ہے چھو کرے.....؟“ مراد نے حیران ہو کر کہا۔ ہم گاؤں چھوڑ کر شہر کیسے جائیں گے“

‘ ‘.....

ارے چپ بیٹھو جی تم دونوں.....“ احمد بی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

یہی وخت ہے کیا مراد تیرے کو سمجھانے کا؟ اس کے منہ سے ابھی تک خون بہہ رہا ہے جی.....“ میں کیا کروں گے میری اماں۔

‘ ‘..... کوئی حکیم صاحب کو بلا اور..... نورا..... ذرا اسی باریک مٹی تو چھان کر لا“

احمد بی جانتی تھی کہ سلیم کہتا تو ہے کہ گاؤں سے چلا جائے گا۔ مگر وہ گاؤں سے کیوں نہیں جاتا، یہ بات مراد نہیں سمجھتا۔ جب سے ملیشمن نے اسے اپنے گھر آنے سے روکا ہے اس کا جی کھیتوں میں لگتا ہے نہ گھر میں۔ اس کے سب چھوٹے بھائی محنت مزدوری میں لگے تھے۔ بی جانی اور گوری بی کی شادیاں ہو گئیں۔ احمد کی اکیلی پڑی کرا ہے جاتی تھی۔ اب اس محنت مزدوری نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے وہ مراد کے بچے شابو کو گود میں لئے بیٹھی رہتی تھی۔ روتے روتے اسے کم سمجھائی دیتا تھا، اس لئے اب وہ صرف سلیم کی بو کر رہ گئی تھی..... سلیم بھی دن بھر اماں کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ گم سم کسی.....کونے میں بیٹھا بیڑی پئے جاتا۔ جانے کونسی سوچوں میں گم رہتا ہے اُجاڑ صورت

ملیشمن ریڈی نے مارا تو کیا ہوا..... وہ ہمارا ساہوکار ہے۔ مار سکتا ہے تو اس کے گھر کیوں نہیں جاتا۔ ان کے ہاں ”  
“..... اتنا باسی کھانا بچتا ہے، کتوں کو ڈالتے ہیں..... رتنا تیری راہ دیکھتی ہوگی

ر رتنا میری راہ دیکھتی ہوگی؟ کیوں؟ اس گھر میں تو ملیشمن ہر کام کر رہا ہے..... وہ تو وینکٹی کی مسہری پر ”  
.....جالپٹا۔ اور بچاری رتنا.....کتنا اثر گئی تھی اس دن رتنا... اب وہ اکیلی ہے..... میری راہ دیکھتی ہوگی

اماں، میں ذرا وینکٹی کے گھر جا رہا ہوں۔“ سلیم نے باہر جاتے جاتے کہاں مگر اسی وقت مرا لکڑیوں کا گٹھائے ” اندر آیا۔

تو نکو جا سلیم، پوشمّا بولی ہے کہ کل سے نوراً کو کام پر بھیجوان کے گھر۔“ اس نے دھڑ سے ” لکڑیوں کا گٹھائے میں پر پھینکا مگر وہ سلیم کے دل پر جا گرا۔

‘ ‘ .....بھابی کو.....! نہیں..... میں بھابی کو ریڈی کے گھر نہیں جانے دوں گا۔“

ارے تو چپ بیٹھ گئے پوٹھے۔“ احمد بی نے خوش ہو کر کہا۔“ پوشمّا بڑی دیا لو عورت ہے۔ وہ مہربان ہوگئی تو تم دونوں بھائیوں پر ریڈی کی سختی بھی کم ” ہو جائے گی۔ کل سے شابّ کو میں سنبھالوں گی۔ نوراً تو ریڈی کے ہاں کام کاج کرنے چلی جا۔

ریڈی کا کام کاج..... نوراً نے لرز کر سوچا۔ وہ آج تک کسی تحصیلدار ریڈی یا جاگیردار کی چوکھٹ نہیں چڑھی تھی۔ مراد اور سلیم تو اسے دروازے سے باہر بھی نہیں جانے دیتے تھے..... ریڈیوں کے گھر کی جھوٹی ہانڈیاں دھونا۔

اگے مری اماں..... میں کیا کروں گے۔

بھابی ریڈی کے گھر نہیں جائے گی..... سلیم غصہ کے مارے آنکھ میں ٹہلنے لگا۔

تو جب کمانے لگے گا تو اسے نہیں بھیجوں گا۔“ پسینے میں نہایا ہوا مراد آنکھ میں بیٹھ کر لمبی لمبی سانس لینے ” لگا۔

“میری چھاتی میں بہت درد ہونے لگا ہے۔ مجھ سے اب بوجھ نہیں اُٹھتا۔“

سلیم نے بھائی کی بات پر سر جھکا لیا۔ وہ اپنے جو وں بھرے بال کھنچانے لگا۔

روتی سسکتی ہوئی نوراً بلکتے ہوئے بچے کو ساس پر ٹیک کر ریڈی کے ہاں کام پر چلی گئی۔

دن ڈھلے، جب وہ چکنائی اور کالک میں سے ہاتھ، پھٹی ساری کے پلو سے پونچھ کر گھر جانے لگی تو اس کی نظر دالان پر گئی۔ آرام کرسی پر بیٹی ملیشتم اخبار کی بجائے جانے کب سے اسے پڑھ رہا تھا۔ نوراً کو دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ پھر اس نے اپنی ماں سے کہا۔

“ماں! اس چھوکی کو کچھ بچا ہوا کھانا ہے تو دیدو۔“

اور پوشمّا نے باسی چاول، اچار، اور کھٹا دبی ایک پترولی میں ڈال کر نوراً کی ساری کے پلو میں رکھ دیا۔

منہ پھیر کر ناک چڑھا کر نوراً نے بے دلی سے وہ کھانا لیا تو غصہ کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ کیا ہم بھکاری ہیں جو پوشمّا نے باسی کھانا دیدیا۔ اس کا جی چاور ہا تھا اس پتر ولی کود ہینانگن کے کوڑے میں پھینگ دے۔ مگر دال کی خوشبو نے اس کے سارے انگ میں بھوک جگادی۔ راستے میں اس نے انگلی ڈبو کر دال چکھی اور پھر گھر جا کر وہ پتر ولی ساس کے سامنے پٹک دی۔

اُتا بھوت سا کھانا .....! احمد بی نہال ہوگئی۔ صبح سے بہو کوریڈی کے گھر بھیجنے کی جو کوفت تھی وہ ختم ہوگئی..... سب بچے کھانے کی بُو پا کر اُس پاس اکٹھے ہو گئے۔

.....سلیم اٹھ، تو بھی کچھ منہ میں ڈال لے“ کل سے سب بھوکے تھے گھر میں”

تو چپ بیٹھتی کہ اٹھا کر موری میں پھینکوں وہ کھانا۔“ سلیم نے لیٹے لیٹے سر اٹھا کر کہا۔“

آج کتنے برس کے بعد ریڈی کے گھر کے کھانے کی مہک اس گھر میں آئی تھی۔

احمد بی کومستان یاد آنے لگا۔ روز اخبار کے کاغذ میں لیپٹ کر جھوٹی روٹیاں دال چاول ترکاری بھاجی لاتا تھا۔ اس کھانے کے سہارے گیارہ بجے بڑے ہوئے۔ پندرہ برس بیتے۔ اللہ بھلا کرے اس کا۔ مستان کو جانے کیا پاگل پن سوار ہوا کہ جس بانڈی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔

ایک دن نوراً پوشما کے سر میں کنگھی کر رہی تھی۔ دو پہر کا وقت تھا۔ رتناً اپنے بچوں کے ساتھ کمرے میں سو رہی تھی۔ ہر طرف گھر میں سناتا تھا کہ ملیشمن باہر سے آیا۔ نوراً اسے اندر آتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

‘ ‘ ..... ماں، ذرا اس چھوکری کو کمرے میں جھاڑوں لگانے بھیج دونا

..... ۱۰ سے؟“ پوشما نے گھبرا کے ملیشمن کو دیکھا ”

اب اسے گھر جانے دے دے۔ اس کا بچہ چھوٹا ہے پوشما نے رُک رُک کر کہا۔

ماں ! میں کیا بول دوں ؟ ملیشمن نے گھور کے ماں کو دیکھا۔ شراب کی بو سارے دالان میں پھیل گئی۔

پوشما جانتی تھی کمرے میں جھاڑوں دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے کمر میں اڑسی ہوئی تھیلی میں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر نوراً کو دیا۔

“جا ..... کمرے میں جھاڑوں دیدے۔ یہ پیسے رکھ لینا۔”

نکو میرے کو ...“ نوراً نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ..... بھلا صرف ایک کمرے میں جھاڑو لگانے کا معاوضہ دس روپے۔ ” اسے تو اس گھر میں مفت کام کرنا ہے۔ اس کا شوہر جور بن ہے یہاں

جب ریڈی باہر آجائیں گے تو شام کو جھاڑو دوں گی“ نوراً نے نوٹ واپس دے کر کہا۔

! کمرے میں ریڈی تھا۔ وہ کیسے جائے اندر۔

چپ... چپ...“ پوشمانے کا نپتے ہوئے نوراً کو کمرے میں ڈھکیلا۔

شور مچایا تو ریڈی تم سب کو جان سے مار ڈالے گا۔ .....“ اور پوشما نے اسے اندر ڈھکیل کر باہر سے زنجیر لگائی تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ..... پھر وہ دھڑام سے تخت پر گری اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

اماں..... کیا ہوا اماں تیرے کو.....؟“ اسے روتا دیکھ کر رتناً گھبرائی ہوئی کمرے سے نکلی۔ اس نے اپنی کا نپتی ” ہوئی ساس کو دونوں ہاتھوں میں تھاما۔

وہ سمجھ گئی کہ پوشما کو اپنے مرے ہوئے بیٹے کی کوئی بات یاد آ گئی ہے۔

نکورو ماں..... ابھی تو ہمیں جانے کیا کیا دیکھنا ہے۔“ اس نے اپنی ساس کے ”

آنسو پونچھے

سب سو گئے گھر میں۔ مگر نورامٹی کا تیل لے کر مراد کے دکھتے پیروں پر مالش کرنے نہیں اُٹھی۔ وہ تو جب سے ریڈی کے ہاں سے آئی تھی۔ منہ لپیٹے کوٹھری میں پڑی تھی۔

احمد بی ، مراد اور سلیم جانتے تھے کہ نورآ کو ریڈی کے ہاں کام کرنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ وہ زبردستی وہاں بھیجی گئی ہے۔ اس لئے سب سے خفا ہے۔ بچاری پھول جیسی معصوم نورآ جو اکیلے باؤلی (کنوئیں) پر جانے بھی ڈرتی تھی۔ اس نے تو کبھی اپنی نندوں کے ساتھ کھیتوں پر مزدوری بھی نہیں کی تھی ..... بہو، گھر کی لچھمی ہوتی ہے۔ خاندان کی عزت۔ اس لئے احمد بی نے اسے بھی گھر سے باہر نہیں نکالا تھا۔

جب کبھی نورآ شوہر سے ناراض ہوتی تھی تو اپنی کوٹھری میں سونے کی بجائے گھر کے کسی کونے میں جا کے سو جاتی تھی۔ پھر آدھی رات کو مراد اُٹھتا اور چپکے سے اس کے پاؤں کو دباتا تھا۔ وہ ہڑ بڑا کے یوں اٹھتی جیسے مراد کے انتظار میں جاگنے کی بجائے سچ مچ سو رہی ہو۔

مگر آج نہیں اٹھا۔ اس میں اب اٹھنے کی اور نورآ کے پاس جانے کی جیسے ہمت ہی نہ رہی ہو..... وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ آج جانے کتنے کھٹمل اس کا خون چوس رہے تھے۔

پھر وہ بڑی مشکل سے اُٹھا اور نوراً کے پاس جالیٹا۔ مگر نوراً منہ پھیرے لیٹی تھی اور رو رو کر اس نے اپنا تکیہ بھگو لیا تھا۔ پھر جب مراد نے زبردستی نوراً کو اپنی طرف کھینچا تو ٹھٹک گیا۔ نوراً کے گالوں سے، سارے بدن سے شراب کی بو آ رہی تھی مراد کے بدن میں جیسے کسی نے آگ لگادی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا..... بس اب بہت ہو گیا صبر۔ باوا کی درانتی اماں نے جانے کہاں چھپا کر رکھی ہے۔ وہ کھڑا ہوا تو لا لو سے ٹکرایا۔ اس کے قریب شابو لیٹا تھا۔ اور چھوٹو

.....نوراً کی چھاتی سے چپکا ہوا تھا..... تین بجے..... مراد جیسے کھڑے سے گر پڑا

وہ پھر نوراً کے پاس جا لیٹا۔

اس بار اس نے اپنی پوری قوت سے نوراً کو اپنے دل میں، اپنی روح میں جذب کرنا چاہا۔

نہیں..... میرے پاس اب بھی نکو آؤ..... میں تو میں باؤلی میں گر کو جان دے دوں گی.....“ نوراً نے پاگلوں ” کی طرح اسے دور ڈھکیل دیا۔ رات کی سیاہی نوراً کے منہ پر سے ہٹتی تو صبح اس نے پلو میں بندھا ہوا دس روپے کا تڑا مرا نوٹ کھول کر مراد کے حوالے کیا۔

دس روپے.....؟ مراد نے تعجب سے نوٹ دیکھا، کبھی نوراً کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ نوراً سے کیا کہے ” .....!

میں.....میں کیا کروں... اماں کو دیدے... وہ بچوں کے لئے کچھ

لا کر پکارے گی... گائے کی کلیجی لاکر احمد بی چولھے پر رکھی تو خوشبو سارے محلے میں پھیل گئی۔

آج تو احمد بی کے ہاں گوشت پک رہا ہے..... اس کی پڑوسن نرسیا کی ماں نے اطمینان کی سانس لی۔ اچھا ہے۔ بچاری بڈھی روز سارے محلے سے بچوں کے لئے گنجی (چاول کے پینچ ) مانگتی پھرتی ہے۔

کلیجی کی خوشبو نے احمد بی کو اتنا پاگل کر دیا تھا کہ وہ بار بار ہانڈی کھول کر چھوٹے بچوں کی طرح سالن کا مزہ چکھ رہی تھی ، اور یہ بھول گئی کہ آدھان سر پر آگیا۔ مگر سلیم کیوں نہیں اُٹھا آج..... کب تک منہ لیٹے پڑا رہے گا۔

احمد بی رکابی میں کھانا رکھ کر اس کے پاس لائی۔

‘ ، ‘.....سلیم اُٹھ رہے..... کھانا کھا لے۔ ٹوکل سے بھوکا ہے

سلیم تڑپ کر اٹھا اور غصہ میں لات مار کے رکابی آنگن میں اُچھال دی۔

بھابی کی کمائی کھاتی ہے سالی بڈھی..... تیری ماں کی..... اس نے اماں کو ایک جھانپڑ رسید کیا اور وہ دیوار سے جاتکرائی۔

آج ایک ایک کو مزہ چکھاؤں گا..... میں نے رات کو بھابی کی سب باتیں سن لی ہیں۔

احمد بی ڈر کے مارے سر جھکا کر وہیں بیٹھی رہی۔ بجے سلیم کی چیخ پکار سے ڈر کے رونے

لگے۔ پھر سلیم نے چولھے پر سے گرم ہانڈی اٹھائی اور آنگن میں پٹک دی.....” تو نے ہی بھیجا ہے بھابی کو وہاں۔ بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ سالی۔ کتے کی اولاد۔ آج اس ریڈی کا خون پی جاؤں گا۔ کیا سمجھا ہے اس نے میرے کو۔ میں مستان کی اولاد ہوں۔ اس کا سر پھاڑ کے دم لوگا۔

احمد بی جا کر سلیم پاؤں پر گر پڑی۔

میں تیرے پاؤں پڑتیوں کے بیٹا۔ اب چپ بیٹھ تیرے بھائی کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔“ احمد بی ڈر کے مارے تھر تھر ” کانپ رہی تھی۔



مر نے دو اس بجڑے کو..... جوروں کی کمائی کھاتا ہے وہ سالا..... آج اسے بھی ختم کر ڈالوں گا۔“ سلیم کو ٹھہری ”  
میں گھس کر باوا کی درانتی ڈھونڈنے لگا۔

کوٹھہری سے وہ باہر آیا تو سامنے نورا کھڑی تھی۔ سر پر پرانے کپڑوں کی ایک گٹھڑی اٹھائے ، ہاتھوں میں ٹوٹے  
.....پھوٹے برتن سنبھالے۔ دیور کے غصہ سے بے خبر وہ اندر آئی اور سانس سے بولی

”اماں اب تو مجھے کام کرنے کہاں بھیجے گی۔ ملیشم ریڈی کے گھر والے تو شہر چلے گئے۔“

کیا.....؟ سلیم نے اوپر اٹھائی لاثھی زمین پر پٹک دی۔

”شہر چلے گئے؟ تو کیا اب لوٹ کر نہیں آئیں گے۔؟“ احمد بی نے تعجب سے پوچھا۔

‘ ‘ .....ننیں..... اب وینچ رہتے کتے۔ سب لوگ گئے ریڈی کی اماں، بچے اور..... اور ”

اور..... اور کون.....؟ سلیم نے گھبرا کے بھابی کو دیکھا۔

اور کون کون تھا جانے۔ لاری بھر کو سامان، عورتاں بچے..... ابھی گئے وہ لوگ..... شابو نے آنگن میں گلی پر  
.....ٹنڈا مارا اور گلی اچھل کر دالوار کے پار جاگری

شابو نے ٹنڈا از مین پر پٹک کر کہا۔

”سالی بہت دُور جا گری۔“

کون؟ کون چلی گئی؟ احمد بی جھک کر کھیلتے ہوئے شابو سے پوچھا۔ مگر کوئی ہوتا تو ”

.....جواب دیتا

کون چلی گئی.....؟ خالی گھر میں احمد بی کی آواز گونجی اور گاؤں کے پہاڑوں سے جا ٹکرانی۔ مرگ لگنے سے  
.....پہلے چلنے والی تیز بوائیں جیسے زمین و آسمان سے پوچھ رہی تھیں..... کون چلی گئی..... کون چلی گئی

سلیم لاثھی آنگن میں پٹک کر دیوانوں کی طرح وینکٹی کے گھر کی طرف بھاگ رہا تھا..... پینٹل کی کیلوں سے جز  
انقش و نگار والا بھاری بھر کم اونچا دروازہ آج پہلی بار سلیم نے بند دیکھا۔ یہ موٹا تالا لگا ہوا تھا۔ ضدی بچوں کی طرح اس نے  
تالا جھنجھوڑ ڈالا..... پھر وہ دروازے کے اوپر لٹکی ہوئی آم کے سوکھے پتوں کی جھال دیکھنے لگا۔ دروازے کی موٹی دہلیز  
کو بلدی سے رنگ کر اس پر سیند دور اور گیرو کے ٹپکے لگائے تھے..... کس نے.....؟ دروازے کے دونوں طرف چراغ  
رکھنے کے طاق دھوئیں سے کالے ہو چکے تھے۔

بچاروں کے گھر چراغ بجھ گیا..... سلیم نے مڑ کر دیکھا..... رتنّا کے ہاں

جھاڑو دینے والی پوشا، بڑے حسرت بھرے انداز میں بند دروازے کو دیکھا رہی تھی۔

‘ ‘ وہ بچاری تو نہیں جارہی تھی دیورز بردستی لے گیا۔“

کون؟“ سلیم نے ناخنوں سے ایک کیل کو اکھاڑتے میں پوچھا۔

وہی رتنم “پوشائے تھیلی کھول کر پان بناتے میں کہا۔

‘ ‘ بھگوان کسی کو جوانی میں بیوہ نہ کرے..... اب بچاری مجبوری ہے، جو لوگ کہیں گے ، ماننا پڑے گا اسے ”

نہیں ، کوئی رتنماً کوزبردستی نہیں لے جا سکتا۔ میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔“ سلیم نے دروازے پر ایک لات ماری ”  
اور دوڑا گاؤں کی سڑک کی طرف

ٹھہرو.....ٹھہرو.....ابھی مت جاؤ۔ اپنے پیروں سے اڑنے والی دھول میں وہ خود ہی چھپتا جا رہا تھا۔

کھیتوں میں بیچ ڈالا جا رہا تھے۔ مرگ کی تیز ہوائیں ہر چیز کو تہہ و بالا کر رہی تھیں چڑیاں اور کوئے چاروں طرف  
.....چلاتے پھر رہے تھے

دونگلو.....دونگلو.....دونگلو.....دونگلو

پھاڑوں کی چوٹی پر بیٹھی سیاہ چہرے والی پو چما ( کالی ماتا ) اپنی بڑی بڑی آنکھیں

کھولے بڑی حیرت سے سلیم کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہی تھی وہ دھول میں آہستہ آہستہ چھپ رہا تھا ...ہوا میں اڑتے ہوئے پر کی  
.....طرح..... ایک داہمے کی طرح فضا میں تحلیل ہو رہا تھا

.....صبح سے شام ہو گئی سلیم لوٹ کر نہیں آیا

.....وہ ملیشیم کو قتل کرنے گیا ہے..... احمد بی یہ سوچ سوچ کر گھبراتی جارہی تھی

.....ٹر کے مارے مراد کو تو بخار چڑھ گیا تھا..... سب سر جھکائے گم سم بیٹھے تھے

.....شام سے رات ہوئی ابو خاں کا بیٹا قاسم بچوں کے لئے بیچ لے کر آیا

“مراد بھائی صبح سلیم شہر چلا گیا .....ایک ضروری کام سے جا رہا ہوا۔“

شہر چلا گیا .....؟ مراد نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر درخت سے کٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑا.....ہوا مرے تو  
ریڈی نے دونوں بھائیوں کو دو بیلوں کی طرح کام کی بندی میں جوت دیا تھا۔ باقی سب بھائی تو ابھی بہت چھوٹے تھے۔ لکڑی  
کے سخت تنے توڑتے وقت، مٹی، جون کی گرمی میں بوجھا اُٹھاتے وقت ، ریڈی کی مار کھاتے وقت کبھی سلیم اس کے ساتھ  
نہیں ہوتا تھا مگر ایسا لگتا جیسے آدھا بوجھا سلیم ڈھوتا ہے۔ سلیم کچھ نہ کماتا تھا۔ مگر مراد کو اس کا بہت بڑا سہارا تھا۔ ریڈی  
شہر جاتے وقت کہہ گیا ہے۔ وہ یہ اُٹھ دن میں ایک بار دیکھ بھال کرنے آیا کرے گا۔ جب ریڈی کو معلوم ہوگا کہ سلیم شہر چلا گیا  
ہے تو سارے خاندان پر ایک اور آفت اور آنے گی اب۔

تیرے کو اڑھائی گھڑی کی موت آو... تیرے صورت کو انگھارے لگو..... کوئی بھاگورے..... کوئی اس اجاڑ ”  
صورت کو پکڑ کے لاوے.....“ احمد بی سر پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی۔

یہ خبر جھوٹ کے رنگوں میں ڈبو کر، کلیان پھند نے ٹانک کر جب پولیس پیٹل نے ملیشیم ریڈی کو سنائی تو غصہ کے  
مارے اس کا برا حال تھا۔ لیموں کی طرح اس نے مستان کے خاندان کو کس کس کر نچوڑ پھینکا۔ مگر یہ سالاسلیم بہت اکڑتا ہے۔  
اس کا کس بل نکالنا ہی پڑے گا اب۔

سلیم سب سے پہلے شہر کی پولیس چوکی پر گیا اور وہاں رپورٹ لکھوائی کہ گاؤں کا ایک ساہوکار زبردستی اپنی  
بہاوج کو لے کر شہر بھاگا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو بہاوج کو بلا کر پوچھ

.....بجاری بیوہ ہے.....

کون سا ہو کار..... کہاں سے آیا..... بندو ہے یا مسلمان..... تم اس کے کون لگتے ہو.....“ شہر کے پولیس  
کانسٹبل نے اسے غور سے گھورا۔

تم اس کے کون لگتے ہو؟ سلیم نے سر جھکا لیا... پھر وہ ایک وکیل کے ہاں پہنچا مشورہ کی فیس پچیس روپے ”  
ہوگی، سلیم آگے بڑھا... ایک اخبار کے دفتر گیا، ہم ایسی خبریں نہیں چھاپتے ہیں۔ کوئی مزے دار چٹ پٹی خبر ہو تو... ایسے  
لڑائی جھگڑے تو روز بوتے رہتے ہیں

غصہ میں سلیم نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر ادھر پھینکا، جدھر سے ایک منسٹر کی موٹر آرہی تھی ..... ان کی ماں کے .....  
سالے.....

...دونگلو.....دونگلو..... کائیں کائیں کائیں...لو...وہ سالا گاؤں والا کوا یہاں بھی اس کے سر پر چلاتا ہوا اڑ رہا تھا  
...

بابو میاں کے گیارہ سال لاریاں تھیں۔

رات کو سب ڈرائیور اور کلینر لاریوں کے اندر ہی سو جاتے تھے۔ رات کو وہ سب آس پاس کے سیندھی خانوں میں سیندھی پیتے۔ کسی بھٹیاری خانے میں کھانا کھاتے، مگر بھوک پھر بھی باقی رہتی تھی۔ لاری کے سب ہی مالکوں کا یہ حکم تھا کہ کام کرنے والے لاریوں کے اندر ہی سوئیں۔ صبح پانچ بجے اٹھ کر لاریوں کے دھونا۔ اور کل پرزوں کی جانچ پڑتال کرنا، پھر صبح سویرے لاریوں کے اڈے پر پہنچ جانا پڑتا ہے کبھی کبھی راتوں ہی کو سامان ڈھونے کا کام مل جاتا ہے۔

اس لئے شہر میں رہنے والے بال بچوں والے ڈرائیور، کبھی کبھار اپنی ڈیوٹی بدل لیا کرتے تھے۔ مگر سلیم جیسے نو جوان چھو کر وں کو گریج سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ شام کو لاری گریج میں رکھنے کے بعد وہ کھانے کے لئے باہر نکلتے کچھ لوگ وہیں گریج میں اینٹوں کا چولہا بنا کر چاول اُبال لیتے تھے۔ کیونکہ ان میں زیادہ تر سلیم جیسے گاؤں کے لڑکے تھے جو پولیس ایکشن میں اپنے خاندان کی تباہی کے بعد گھر سے نکلے تھے۔ انہیں اب زیادہ پیسے بچا کر گھر بھیجنا پڑتے تھے۔ گاؤں میں ان کے ماں باپ بھوکے تھے۔ بہنوں کی شادیاں رُکی ہوئیں تھیں۔ بڑے بھائی ساہوکار کے ہاں رہن پڑے تھے۔

بابو میاں نے نوکری دینے کی پہلی شرط یہ رکھی تھی کہ دو برس سے پہلے یہ نوکری چھوڑ کر دوسری نوکری نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے وہ تین مہینوں کی تنخواہ ہمیشہ اپنے پاس رکھنا تھا۔ جب تک پہلی تنخواہ نہیں ملے گی، بابو میاں جو پیشگی پیسے دیں گے، وہ معہ سود کے واپس کرنا ہوں گے۔ اگر کوئی دن یا رات میں بغیر اجازت کے کہیں جائے گا تو جرمانے کے طور پر آٹھ دن کی تنخواہ کاٹ لی جائے گی۔

اقرار میں سر بلاتے وقت یہ کتنی آسان باتیں لگی تھیں۔ مگر آدھی رات کو جب لاری کا ڈرائیور کمر پر لات مار کے..... اُٹھاتا کہ لاری لے کر اب محبوب نگر جانا ہے تو وزنی بورے ڈھوتے وقت جی چاہتا کہیں بھاگ جاؤ..... مگر کہاں

بابو میاں کے کارندے تو سارے حیدرآباد میں پھیلے ہوئے تھے۔ سب لاری کے مالک ایک دوسرے کے دشمن تھے، مگر ڈرائیوروں اور کلینروں کو سزا دیتے وقت وہ سب ایک ہو جاتے تھے..... آدھی رات کو جب چوری کا مال لے کر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو پار کرنا ہوتا تو کلینر کو مال کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔ چوکی پر بیٹھے پہرہ دار کو کچھ دے دلا کر پٹانا اسی کا کام تھا۔ اور اگر پکڑے گئے تو پولیس کی لاٹھیاں، جوتے کھانا حوالات میں بند رہنا، جیل جانا، یہ سب ان ہی کا کام تھا۔ اس وقت تک منہ بند رکھنا ہوتا۔ جب تک لاری کا مالک اوپر والوں کی مٹھی گرم کر کے انہیں چھڑا نہ لے۔

سلیم نے یہ باتیں سنی تو رونے لگا۔ سارکلینر ہنسنے لگے۔

(اے گاؤں میں اماں کا دودھ پیتا تھا کیا۔ یہ شہر بے بابو۔ یہاں بنو لا پنا (بے وقوفی)

”نہیں چلتا۔ چالو آدمی ہونا۔

تو کیوں رویا تھا اس دن؟ ایک دن مالن بی نے اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا..... مالن بی سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی تھی۔ بابو میاں کے بنگلے میں اوپر کا کام کرتی تھی۔ کسی گاؤں سے محنت کرنے آئی تھی۔ ڈبلی پتلی، سانولی سی، ہر وقت ہنسنے سے کام تھا۔ جب بیگم صاب گالیاں دیتی تھیں یا جلتی لکڑی سے مارتی تھیں تو وہ روتی ہوئی گریج میں آتی اور پھر ہنسنے لگتی تھیں۔ گریج میں رہنے والے ڈرائیور، کلینر اس سے باتیں کر کے خوش ہو جاتے کہ ادھر کسی عورت کا گذر ہو جائے یہی بہت تھا۔

گاؤں کا ساہوکار میرے کو شہر نہیں آنے دیتا تھا۔ میں چوری سے بھاگا۔ اب کتنے بابو میاں میرے کو گاؤں نہیں جانے دیں گا، سلیم کو پھر رونا آگیا۔

بنو۔ یہ شہر کے لوگ بہت حرام کے ہیں۔ میرے کو بھی ایک سال کے بعد آٹھ دن کی چھٹی ملے گی۔ تیرا کونسا گاؤں ہے؟

‘ ‘ چیکٹ پلی ، اور تیرا؟ ”

”میرا گاؤں بلا پاؤ۔“

تو چھوکری ہو کر شہر کیوں آئی؟ ڈر نہیں لگتا یہاں رہتے ہوئے؟“ سلیم نے پوچھا۔

وہ میرا منگیتر گاؤں کے سابوکار کو مارا تھا تو پولیس والے اس کو پکڑتے بول کر آئے کہیں چلا گیا ہے۔ اس لئے ” میری شادی رُکی ہوئی ہے۔ گاؤں میں اب کوئی ہم لوگاں کو مزدوری نہیں دیتا بول کے میری نانی ہماری ایک سگی عورت کے ساتھ میرے کو یہاں بنگلے میں نوکری کرنے بھیج دی۔ میں اپنی تنخواہ پر مہینے جمع کر کے گاؤں لے جاؤں گی۔ بس اب پانچ مہینے اور ہیں۔ مدار، مولا نا ، رجب، شابان خواجہ معین الدین۔“ مالن بی انگلیوں پر مہینے گنتے لگی۔

کتے روپے جمع کر لی تو ؟ سلیم نے تجس بھرے لہجے میں پوچھا۔

پچاس“ مالن نے آہستہ سے کہا کہ کوئی سن نہ لے، اور پھر اس نے بے حد خوشی کے ساتھ ایک اور بات سنائی۔

”وہ جو چھوٹے صاب ہیں نا۔ انوں ایک دن کمرے میں بلا کر بولے، مالن ! میں بھی تیرے کو دس روپے دوں گا۔“

کیوں.....؟ وہ سالا تجھے دس روپے کیوں دے گا.....“ سلیم نے بے غصہ میں پوچھا۔

کیوں دے گا.....؟“ یہ بات مالن بی نے بھی زمین پر نظریں گاڑھ کے سوچی اور پھر بے فکری سے گردن ہلا کر ” بولی.....“ کیوں دیتا کی۔ میرے کو بھی نہیں معلوم جی۔

اوحرام کی پوٹی۔ دیکھ پھر کبھی تو چھوٹے صاب کے کمرے میں گئی نا تو تیری ٹانگاں توڑ دوں گا۔ کیا کبھی ” میرے کو؟“ سلیم کا جی چاور ہا تھا کہ دوڑتا ہوا جائے اور اماں کی پوٹلی میں چھپی ہوئی درانتی نکال کر چھوٹے صاب کا بھیجہ بکھیر دے زمین پر۔ یہ سالے شیطان ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ غصہ میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کے سامنے خواجہ بی نہیں مالن بی بیٹھی ہے۔

‘ ‘ پھر کبھی جائے گی اس بد معاش کے کمرے میں..... بول..... بول۔“؟

.....اس نے مالن بی کی پیٹھ پر دو گھونسنے مارے اور اس کی گردن دبائے لگا

ننیں جاتی..... ننیں جاتی..... تیری خسم ننیں جاتی رئے“ مالن بی ڈر کے

مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ بھی جیسے بھول چکی تھی کہ آج پہلی بار اس نے سلیم سے بات کی تھی۔ پھر وہ کون ہوتا ہے اسے مارنے والا؟

مارکھانے کے بعد بھی مالن بی اٹھ کر اندر بنگلے میں نہیں گئی۔ وہیں بیٹھی ناک پونچھ پونچھ کر روتی رہی۔ غصہ میں ہانپتا ہو اسلیم بھی اس کے پاس آبیٹھا۔ اس نے جیب میں سے بیڑی نکالی۔ مگر سلگانی نہیں۔ بار بار زمین پر تھوک رہا تھا۔ جیسے وہ تھوک ساری دُنیا میں پھیلے ہوئے سیٹھوں کے منہ پر پڑا رہا ہو۔

دوسرے دن سلیم رات کو اپنے ٹھکانے پر لیٹنے آیا تو اس کے بچھونے کے پاس کاغذ سے ڈھانپ کر ایک رکابی رکھ دی تھی کسی نے۔ اس میں کھجڑی اور کھٹی چٹنی تھی۔ سلیم سمجھ گیا کہ یہ کھانا مالن بی رکھ گئی ہے۔

میں بنگلے والوں کی جھوٹن کیوں کھاؤں.....؟ وہ چھوکری کیا بھکاری سمجھی میرے کو.....!“ سلیم بہت پیچ و ” .....! تاب کھاتا رہا۔ کھجڑی کے ساتھ ساتھ اب گیلی لکڑیوں کا چولہا سلگا کر چاول اُبالنے کا صبر کہاں تھا

بس پھر تو مالنّ بی سے اس کی بے تکلفی بڑھتی گئی ، اس کے آنیل کے چیکٹ دھبے والے میلے کپڑے دھونے کی ذمہ داری بھی مالنّ نے سنبھال لی۔ دونوں وقت اپنے کھانے میں سے بچا کر وہ اس کے لئے کھانا رکھ جاتی تھی۔ جب کوئی کام نہ ہوتا تو دونوں بنگلے کی منڈیر پر بیٹھ کر باتیں کرتے۔

اس چھوکرے نے آتے ہی ایک چڑیا پھانس لی ہے۔“ دوسرے ڈرائیور کلینر سلیم کی ”

قسمت پر رشک کرتے تھے۔

ایک دن مالنّ بی چھوٹے صاب کا پرانا بش شرٹ اور پینٹ لے کر آئی۔

”چھوٹے صاب نے میرے بھائی کے لئے دیا ہے۔ مگر وہ تو ابھی بھوت چھوٹا ہے۔ تو پہن لئے۔

تھو.....میننیں پہنتا۔ تیرے صاب کی اُترن“ اس نے کپڑے اٹھا کر گیرج کے باہر پھینک دیئے ، تو مالنّ بی نے اٹھا ”  
کر اپنے گوڈر کی بوتلی میں باندھ لئے۔

بار بار اسے سلیم سے باتیں کرتے دیکھ کر دوسرے کلینر اور ڈرائیور فحش گانے گاتے ،

گندے فقرے، ننگے قہقہے ان دونوں کی طرف اُچھالتے تھے۔ سلیم کو بہت غصہ آتا تھا۔ وہ بار بار اپنے دوستوں سے کہتا تھا کہ مالنّ بی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تو صرف دل بہلانے یہاں آمیٹھی ہے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ اسے یہاں آنے سے منع کر دے۔ مگر کسی دن مالنّ بی نہیں آتی تو اسے یوں لگتا جیسے اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اتنے بڑے شہر میں اور کون تھا جس سے وہ اپنے دل کی بات کہتا۔ غصہ اتارتا۔ مار پیٹ کرتا۔ مگر جگ ہنسنائی کے ڈر سے اس نے مالنّ کو منع کر دیا کہ وہ گیرج میں نہ آیا کرے۔

ہوا کو کمرے میں بند کر دو تو وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتی ہے وہ باہر جانے کا۔

سلیم کو بھی شنکر ڈرائیور مل گیا۔ اس نے سلیم کو سنے ما“ دکھایا۔ چار مینار کی ہوٹل میں بٹھا کر شکر کی چائے پلائی۔ چار مینار سگریٹ پلایا۔ گڈی انارم کی سیندھی چکھائی اور پھر ایک دن تنخواہ ملی تو محبوب کی مہندی ( طوائفوں کے محلے ) میں کھینچ کر لے گیا۔

دماغ میں سیندھی کی ترنگ، کلہ پان سے گرم کیے، سلگتا ہوا بدن لئے ، ایک رات وہ گیرج لوٹا تو بنگلے کے گیٹ کے پاس مالنّ بی کھڑی تھی۔ ڈر کے مارے کا نپتی ہوئی۔

.....اتی رات کو تو باہر کیوں آئی.....؟“ سلیم نے غصہ میں اسے گھورا

مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اندر۔ گھر کے سب لوگ شادی میں گئے ہیں.....وہ اکیلا ہے.....مجھے ڈر رہا ”  
”ہے.....“ مالنّ بی نے رُک رُک کر کہا.....” چل... اندر جا..... سالی کو مستی چڑھی ہے..... اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے۔

مالنّ بی اندر چلی گئی تو اس کا بدن آگ کی طرح تپنے لگا۔ جیسے ساری ہڈیاں ٹوٹی جارہی ہوں۔ مالنّ بی کتنی موٹی ہو گئی ہے..... سالی کو کیلے ڈر لگتا ہے اب۔ اس نے نہ جانے کیوں مالنّ کو اندر بھیج دیا..... وہ پچھتانے لگا..... پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نشے میں بے سدھ شنکر کو اس نے جھنجھوڑا۔

”شنکر بھائی ، چلو آج پھر چلتے ہیں محبوب کی مہندی۔“

سالے پڑگئی نالت.....“شنکر انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے بورئے پر انہوں نے لاری کے گدے ڈال کر ان پر اپنی ”  
.....چادر میں اڑھا دیں اور پھر گیرج کی دیوار پھاند کر دوسری طرف کود گئے.....دونگلو.....دونگلو

آدھی رات کو کو اچلا رہا تھا۔ کئی دن گذر گئے.....مالنّ پھر گیراج میں نہیں آتی تھی

اب..... اس کی شادی میں دو مہینے رہ گئے ہیں تا..... اب اسے میری کیا پروا ہے۔

سلیم کو بھی شہر آئے سال گذر گیا۔ اس نے دوسروں سے جمع کر لئے تھے۔ پندرہ دن کی چھٹی ملی تو یہ بھی گاؤں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اماں کے لئے ساری خریدی۔ بھابی کے لئے نگوں کی چوڑیاں ، مراد بھائی کے لئے لنگی۔ اور بچوں کے لئے پیپرمنٹ کی گولیاں۔ اس نے اپنے لئے بھی لنگی کی بجائے پینٹ اور بش شرٹ خریدا..... مچی سے پرانی چپلیں لیں۔ اب وہ شہر کا صاب بن گیا تھا..... گاؤں والے اب اسے ڈلیور صاب کہیں گے۔

نہانے کے بعد کپڑے پہنے ، پھر وہ ادھر ادھر آئینہ ڈھونڈنے لگا تو وہ مالنّ بی کی آنکھوں میں کھڑا نظر آیا۔ مالنّ گرج کے دروازے میں کھڑی تھی..... اداس صورت ، جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ ہاتھ میں ایک تھیلی لئے۔

وہ سمجھ گیا..... اس کے گاؤں جانے کی بات سن کر مالن اداس ہو گئی بے بجاری کا شہر میں اور کوئی نہیں ہے نا۔

اب تو کب جارہی ہے اپنے گاؤں ؟ اس نے اپنے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے پوچھا۔ پھر مالن کی روتی صورت دیکھ ” کر گھبرا گیا۔

یہاں گرج میں سب آوارہ چھوکرے رہتے ہیں۔ تیرے کو دیکھ کر ہنستے ہیں وہ لوگ۔ اس لئے میں تجھے یاں نکو آؤ ” بولا تھا۔ تو خفا ہو گئی کیا میرے سے؟

مالن اب بھی کچھ نہ بولی۔ اس نے تھیلی کھولی۔ اس میں سے ایک رومال نکالا رومال میں ایک اور چھوٹی تھیلی بندھی ہوئی تھی۔ تھیلی میں ایک کاغذ کی پڑیا تھی۔ پڑیا کھول کر اس نے دس دس کے آٹھ نوٹ نکالے اور سلیم کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

یہ کیا ہے۔ میرے کو کیوں دے رہی ہے؟ سلیم نے تعجب سے پوچھا۔

.....یہ تو لے جا..... اپنی شادی کر لینا ان رویوں سے.....“ اب ماکن بی سسکیاں لے رہی تھے

میں لے لوں! مگر یہ روپے تو ، تو اپنی شادی کے لئے جمع کر رہی ہے۔؟

نہیں ہو گی۔ اب کبھی نہیں ہوگی میری شادی“ اب مالنّ بی سے چیخیں ضبط نہ ہو سکیں۔

وہ زور زور سے رونے لگی۔ روتے روتے اس نے اپنے کرتے کے گریباں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور سلیم کی طرف برہایا۔

لے..... یہ بھی تو لے لے..... اس دن جب سب گھر والے شادی میں گئے تھے تو چھوٹے صاب نے زبر دستی دے ” دے۔“

کیا..... دس روپے کے نوٹ نے سلیم کو سانپ بن کر ڈس لیا پھر کوئی جادوا سے پتھر بنا گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل..... بھی نہ سکا۔ مالنّ بی کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہ رہی

اس سالے چھوٹے صاب کو مزہ چکھانا ہے..... ایسی تپسی اس نوکری کی۔ مالن تو نکو رو.....خسب خدا کی..... ایک ایک کا خون پی لوں گا..... تو مجھے کیا سمجھی ہے۔

.....حرام زادے ہر جگہ ہمارے کو مارنے بیٹھے ہیں

.....وہ سارا سامان پھینک پھانک بھاگنے لگا

شہر کی بھیڑ بھاڑ..... سائیکلوں ، موٹروں ، بسوں نے اسے چاروں طرف سے گھیرا ..... ٹریفک کانسٹبل نے بار بار سیٹیاں بجائیں..... لوگ چور سمجھ کر اسے پکڑنے دوڑے اور حولات میں بند کر لیا..... لوگوں نے اس پر ترس کھایا..... غنڈوں نے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی..... اس نے مزدوری کی۔ پھر پھوڑے..... رکشا چلائی..... مگر وہ..... بھاگتا رہا..... ر کا تو بشیر علی سے ٹکرایا..... چار مینار کے چائے خانے میں

تم یہاں؟“ ملیشمن نے کیسے چھوڑ دیا ؟ ”

‘ ‘ ..... اس کی ماں کی ”

‘ ‘ مگر تو یہاں کیوں آیا ! کیا کر رہا ہے؟“

بشیر بھائی..... اس رات جب میں بندوقیں دینے آپ کے پاس آیا تھا تو آپ سچی بات بولے تھے۔ میں شہر آیا تھا کہ ” کچھ محنت مزدوری کروں گا۔ مگر یہاں بھی سالے سب ملیشمن کے جیسے شیطان ہیں۔

بشیر بھائی نہیں۔ سائینا بے میرا نام۔ بشیر علی نے آہستہ سے کہا۔“

اچھا اچھا..... سلیم نے اب غور کیا کہ بشیر علی نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی

ہیں۔ اور وہ دھوتی پہنے ہے۔

‘ ‘ تم کیا کر رہے ہو یہاں بشیر بھائی ..... اوہ سا..... سا.....“ ”سائینا ”

بشیر علی نے اپنا نام یاد دلایا۔

اب تو جیل جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ جیل چلا گیا تو پھانسی ہو جائے گی۔ وارنٹ نکل چکے ہیں۔ ٹھہر..... تجھے ” ایک کام دوں گا۔ میرے ساتھ باہر چل..... بشیر علی بہت دُور جنگل میں ایک چھوٹے سے کوٹھری میں لے گیا۔ دس بارہ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں تھیں۔ چاروں طرف گندگی۔ کوڑے کے ڈھیر۔ ایک جھونپڑی کے آگے ایک عورت بیٹھی ، بچی کے سر میں جونیں دیکھ رہی تھیں۔ کہیں برتن ڈھل رہے تھے۔ جھونپڑیوں کی چھتیں پھٹے کپڑوں سے اور ٹین کے پرانے ٹکڑوں سے ڈالی گئی تھیں اتنی بد بو تھی کہ سلیم سے آگے نہیں بڑھا جا رہا تھا۔ بشیر علی سلیم کو لے کر ایک جھونپڑی کے اندر لے گیا۔

پہلے ایک بات سنو سلیم۔ یہ عورت یہاں بیٹھی ہے۔ میرے بیوی ہے۔ میرا نام سائینا ہے۔ میں گاؤں سے کچھ محنت ” مزدوری کرنے یہاں آیا ہوں۔ میری عورت بیمار ہے۔ اس لئے وہ بستی میں کسی دوسری عورت سے باتیں نہیں کرتی۔ تم میرے ”گاؤں والے ہو۔ تمہیں بھی شہر میں مزدوری کرنا ہے۔

.....سلیم نے غور سے دیکھا۔ یہ تو رامیا کی بیوی رنگی تھی

تو شہر کب آئی بھابی.....“ سلیم نے تعجب سے پوچھا”

رنگی چاول چنتے چنتے رو پڑی“ سر پر پلو سنبھال کر بولی۔“

کیا کروں سلیم بھائی تمہارے آنے کے بعد سابوکار نے ہم پر بہت سختی کی۔ تمہاری ”

بھابی کی طرح مجھے بھی روز بلاتا تھا گھر پر۔ بس ایک رات میں وہاں سے بھاگ گئی۔ بڑی مشکل

سے بشیر انا (بھائی) ملے مجھے۔

‘ ‘ اور نرسی کہاں ہے؟“

رنگی کے کچھ کہنے سے پہلے بشیر نے اسے روک دیا۔

اب تم ہمارے پورے گینگ کی مخبری کرنے آئے ہو کیا؟ نرسی بھی کہیں ہوگا۔ اپنا کام کر رہا ہے۔ پوشا کھانا دے ” ”جلدی بھوک سے دم نکل رہا ہے۔



آنگن میں مرغ کے ننھے ننھے چوزے پھدک رہے تھے۔ بشیر علی نے ایک چوزے کو اٹھا کر پیار کیا اور اسے کاندھے پر بٹھا کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے کونے سے ایک گوڈر کی پوٹلی اٹھائی اور اس میں سے ایک فانیل نکالا کر پڑھنے لگا۔

تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ برس کا ڈبلا پتلا سا بشیر علی اس وقت کتنا الگ سا لگ رہا تھا۔ جب رات کے اندھیرے میں وہ نر سا پور کے پل کے نیچے ملا تھا تو اس کی آنکھیں خوں خوار بھیڑیے کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کی کھرج دار آواز میں بندوق کے تراخے سے گونج رہے تھے۔

کہتے ہیں بشیر علی پانچ وقت نماز پڑھنے والا سیدھا سادھا سا نوجوان تھے۔ مگر نظام کی پولیس والوں نے اس کے بھائی کو اسی کے گھر کے سامنے پیڑ سے لٹکا کے پھانسی دی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی بیٹی کو اٹھا کر لے جانے والے جاگیردار کو لاٹھی سے مار کے ہلاک کر دیا تھا۔ بس، پھر بشیر علی انسان سے شیطان بن گیا۔ اس نے ایک پولیس انسپکٹر کی جوان لڑکی کا اغوا کیا جس کی لاش کھیتوں میں ملی۔ وہ تلنگانے کے چھاپہ دستے میں جاملا اور آپا کے ساتھ گوریلا لڑائی میں شامل ہو گیا۔ پولیس ایکشن کے بعد گورنمنٹ نے تلنگانے کی تحریک کو غیر قانونی قرار دیا تو بشیر علی اور اس کے ساتھی انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ اب وہ چھپ کر کام کر رہے تھے۔ گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے تھے بھوکے پیاسے۔ اپنے گاؤں سے، وطن سے دور۔ موت ان کے سر پر منڈلا رہی تھی دشمن گھات میں تھا۔

بشیر علی کے گاؤں میں جب پولیس آنے والی تھی تو اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر راتوں رات پل توڑ دیا تھا۔ اس نے سابوکار کی کھڑی فصلیں جلا دی تھیں۔ سارے پولیس اسٹیشنوں پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ مگر اپنے گاؤں میں وہ ایک ہیرو کی طرح یاد کیا جاتا تھا۔ عورتیں اس کی بہادری کے گیت گاتی تھیں۔ اسے گرفتار کرنے پر پانچ ہزار کا انعام تھا مگر کتنی بار کتنے گاؤں میں لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ لیکن کسی کو پانچ ہزار کا انعام لینے کا خیال نہیں آیا۔

گاؤں میں بوڑھی عورتیں اسے پناہ دیتی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں اس کے زخموں کی مرہم

پٹی کرتیں۔ وہ جدھر جاتا لوگ اس کا راستہ صاف کرتے۔ اسکی سلامتی کی دُعاں مانگتے تھے۔ گاؤں والے جانتے تھے کہ اب صرف دلم (چھاپہ مار دستے) والے ہی انہیں نجات دلوائیں گے۔

سلیم بڑے غور سے بشیر علی کو دیکھ رہا تھا۔ سنا ہے میٹرک پاس ہے یہ آدمی۔ اچھا مزے

میں کسی آفس میں بابو صاحب بن سکتا ہے۔ خواہ مخواہ اپنی زندگی برباد کر رہا ہے۔ اس کے مارے سے کیا دنیا کے سب شیطان ختم ہو جائیں گے۔

تم آج مجھے خوب ملے۔ بس اب جب تک کوئی کام نہ ملے تم میرے نوکری کرو۔ پیسہ دھیلا کچھ نہیں ملے گا۔ پو شما ”  
”آج سے صبح وشام سلیم کو کھانا کھلا دیا کرو۔

”لو یہ کاغذ راحت صاحب کو دینا ہیں۔ دبلے پتلے لمبے سے شاعر ہیں وہ۔“

”مگر وہ مجھے پہنچائیں گے کیسے.....؟“

اونہ.....میں نے خط میں سب لکھ دیا ہے۔ تم ان سے کہنا۔ میں آپ کے گاؤں سے آیا ہوں۔ آپ کی اماں نے یہ خط دیا ”  
بے۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ کس کا محط ہے۔“ بشیر علی نے ایک بیڑی نکال کر سلگائی۔

پہلے تم بیچلر کوارٹرز پر جا کے دیکھ لو۔ اگر وہاں راحت نہ ملیں تو اور بنٹ ہوٹل چلے جانا اگر وہاں بھی نہ ہوں تو ”  
ہاں پہلے ایک بات سن لو... یہ کاغذ سب کے سامنے مت دینا۔“ سلیم اس کی سب باتوں پر سر ہلاتا رہا۔

اچھا، پہلے ایک بات سن لو۔“.....بشیر علی یہ سب باتیں اپنے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا کہ سلیم کی سمجھ نہیں آ رہی ”  
.....تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بہت خطر ناک کام ہے اگر اس نے نراسی غلطی کی تو بشیر علی کی جان چلی جائے گی

تم را ملو بڑھئی ہو.....“ سائنا کے ساتھ کام کرنے والے۔ تم بیدر کے رہنے والے ہو۔ تین بجے ہیں۔ جنگم بستی میں ”  
رہتے ہو۔ یہ سب یاد رہے گا نا؟

جی ہاؤ.....“ اس نے سر ہلا کر کہا۔

میں را ملو ہوں.....جنگم بستی میں رہتا ہو۔ تین بجے ہیں۔ دو دن سے کھانا نہیں کھایا، سائینا گارو.....تھوڑا کھانا ”  
“(دو، ڈرا سانی (بیگم صاحبہ

سلیم نے تلگو میں فقیروں کی طرح کہا تو تینوں ہنسنے لگے۔

یہ راحت صاحب کون ہیں بشیر بھائی؟ سلیم نے کھانا کھاتے میں پوچھا۔

یہ ہمارا کام کرنے والا آدمی ہے۔ چپ شاعری کر تاوں بول کے کسی سے بھی نظماں لکھوا کے مشاعروں میں پڑھتا ”  
ہے۔ بس کسی طرح اس کو ادبیوں، شاعروں تک پہنچا دینے ہیں ہم لوگاں۔ وہاں کی خبریں ہمارے کو معلوم ہونا۔ نا۔ اب توحیدر  
“آباد کے سب شاعراں ہمارا ساتھ دے رہیں۔ ان کو بھی پولیس گرفتار کرنے والی ہے کتے۔

کیوں؟ ان کو کیوں پکڑ رہیں؟“ سلیم کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔ کہیں کوئی اسے بھی نہ ”

.....پکڑ لے خواہ مخواہ یہاں آکر پھنساوہ

“اگر وہ لوگ مخدوم صاحب کو پکڑے نا۔ تو پورا حیدر آباد دجلا دیں گے ہم۔

مخدوم صاحب..... سلیم نے اپنے گاؤں میں یہ نام بار بار سنا تھا۔ بس کا ڈلیور کہتا تھا کہ اب تو اعلیٰ حضرت کی ”  
بجائے مخدوم کی حکومت چلتی ہے حیدر آباد میں..... مخدوم صاب سارے کسانوں کو زمین دلوانیں گے۔ سب کو نوکری ملے  
گی.....انوں غریبوں کے لئے جاگیر داروں سے بھی لڑتیں کتے۔

“بشیر بھائی، ایک دن نرسیا کو بلا و نا۔ بھوت دن ہو گئے اس کو نہیں دیکھا۔

.....نہیں نہیں“ بشیر علی آہستہ سے کہا۔

ہم تینوں ایک جگہ ہوئے تو پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ اس جھونپڑی میں بھی چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ اب میں اڈی کمیٹ  
میں گھر لے رہا ہوں۔ وہاں مولوی صاب بن کر بچوں کو قرآن شریف پڑھاؤں گا اور رنگی کسی انسپکٹر کے بنگلے پر نوکری  
کرے گی۔

.....انسپکٹر کے بنگلے پر؟ سلیم اچھل پڑا۔

.....“ ہر گز نہیں..... میں رنگی بھابی کو کسی بنگلے میں نہیں جانے دوں گا۔

ارے جا..... بھوت دیکھے بنگلے کے صاب لوگ..... مجھے اب بھی وہی رنگی سمجھا کیا جسے تحصیلدار کے ”  
کارندے پکڑ کے لے گئے تھے..... یہ دیکھ.....“ رنگی نے کمر مینسے چمکتا ہوا چا تو نکال کر ہوا میں لہرایا۔

“اب میں ایک پولیس انسپکٹر کے گھر نوکری کرنے والی ہوں۔

‘ ‘ تم لوگ اتنے سوانگ کیسے بھرتے ہو۔ جھوٹ بولتے ڈر نہیں لگتا؟“

کیوں؟ ملیشم ریڈی کے جوتے کھا کر بھی ڈر نہیں نکلا کیا تیرا؟“

“چل چل جلدی سے صاب.....شام ہوگئی، راحت صاب اب بیچلر ز کوارٹر سر نکلتے والے ہوں گے۔

لوگوں سے بیچلرز کوارٹرز کا راستہ پوچھتا۔ سلیم وہاں پہنچا تو نیچے ہی دو کار میں کھڑی تھیں۔ اس پاس بہت سے لوگ تھے۔ لمبے لمبے بالوں والے۔ کالی شیروانیاں پہنے، جھومتے گاتے ہنستے قہقہے لگاتے۔ ان میں راحت صاب جانے کونسے ہیں جب سب لوگ کار میں بیٹھنے لگے تو کسی نے کہا۔

”راحت صاب..... آپ اس کار میں آجائیں۔“

راحت صاب..... آپ کی چٹھی ہے.....“ سلیم کا دل زور زور سے دھڑک

رہا تھا۔ وہ راحت صاب کا ہاتھ پکڑ کے ایک طرف لے گیا۔

”میں راملو بڑھنی ہوں۔ آپ کے گاؤں سے آیا ہوں۔ آپ کی اماں یہ چٹھی بھیجے ہیں۔“

تمہیں سائینا نے بھیجا ہے نا؟“ راحت نے آہستہ سے پوچھا تو سلیم نے گردن ہلائی۔ سب لوگ کاروں میں بیٹھ چکے تھے اور اب راحت صاب کے لئے ہارن بجارہے تھے۔

کیا بات ہے بھئی.....؟“ ایک بڑے بڑے بالوں والے آدمی نے کار سرسر باہر نکال کر پوچھا۔ مشاعرے کو دیر ہوئی جا رہی ہے۔

یار، میرے گاؤں سے ایک آدمی آیا ہے۔ والدہ کی طبیعت خراب ہے۔ ذرا باتیں کر رہا تھا.....؟“ راحت نے چٹھی پھر سلیم کو لوٹادی۔

تو اسے بھی ساتھ لے چلو۔ راستے میں باتیں کر لینا۔“ کسی نے کار میں سے کہا۔

”ہاں..... مگر راملو کا وہاں مشاعرے میں جانا اچھا نہ لگے گا۔ اور پھر وہاں ڈنر بھی ہے۔“

ارے یار، ملیشمن کے ہاں سب چلتا ہے۔ اپنا یار ہے وہ۔ ذرا اپنے گاؤں والے کو بھی یہ تماشہ دکھا دو۔

سلیم، راحت صاب کے ساتھ کار میں بیٹھا تو شراب کی تیز بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کار میں سب شاعر تھے۔ اور کسی مشاعرے میں جارہے تھے۔ راستے بھر وہ سب ہنستے قہقہے لگاتے رہے۔

”یار، ہم تو صرف مسز ملیشمن کے درشن کو جارہے ہیں۔ آج میں نے اس کے حسن پر ایک شعر بھی لکھا ہے۔“

‘ ‘ .....سناؤ“

”نہیں۔ اسی کو مخاطب کر کے سناؤں گا۔“

”مگر یار ملیشمن شراب بھی بڑی نفیس پلاتا ہے۔ اور کھانا بھی بڑا نفیس کھلاتا ہے۔“

دراصل اس کی بیوی جس چیز کو چھو لے وہ نفیس ہو جاتی ہے..... سب ہنسنے لگے۔

مگر اس دعوت کے بدلے ملیشمن کی شاعری جو سننا پڑتی ہے۔“ سب پھر ہنسنے لگے..... سلیم نے سوچا ملیشمن نام کا ہر آدمی ایسا ہی ہوتا ہے شاید۔

”بے وزن مہمل شعر لکھتا ہے وہ۔“

لیکن آجکل اسمبلی کے لئے کانگریس کا ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

( اور ترقی پسند ادیبوں میں بھی گھسنا چابتا ہے۔ ) سلیم لوگوں کے بیچ دبا ہوا بیٹھا تھا

ہاں، بچارہ عوام کے لئے آنسو بہاتا ہے شاعری میں.....“ سب پھر ہنسنے لگے۔“

بنگلے میں موٹر داخل ہوئی۔ پھر بھی چلتی رہی۔ چھوٹے موٹے گاؤں جتنی زمین تھی اس بنگلے کی۔ دونوں طرف ”  
پھولوں کے باڑھ تھی۔ بیچ میں موٹریں جیسے تیر رہی تھیں۔

ایک جاگیردار کی دیوڑھی تھی یہ۔ بہت سستی خرید لی ملیشمنے۔

پور امحل بے محل، یہ سالے گاؤں والوں کو لوٹ کر خوب دولت جمع کر لیتے ہیں۔ جانے کون راجہ ہے۔ ملیشمن.....  
میں نہیں جاتا اندر۔ اتنے بڑے لوگوں میں ایسے گندے پھٹے ہوئے کپڑے پہن کر آ گیا..... اب موٹر رکتے ہی بھاگ جاؤں  
گا..... بشیر علی کے گھر بھی نہیں جاتا..... میں کہاں پھنسوں ان جھگڑوں میں..... کل نوکری ڈھونڈنے جانا ہے..... کار  
.....میں رُک گئیں

اُنیسے.....“ سلیم نے یہ آواز سنی تو چونک پڑا۔“

اس کے سامنے رتنّا کھڑی تھی۔ ہنستی مسکراتی..... رتنّا..... رتنّا

بو ہنس ہنس کر سب کا سواگت کر رہی تھی۔ کٹے ہوئے لہریے دار بالوں کی ٹوکری سی سر پر رکھے۔ ترشی ہو ئیں بھوئیں،  
سرخی سے رنگے ہوئے ہونٹ بغیر آستینوں کا بلاوز اور سیاہ چمکتی ہوئی ساری پہنے۔

یہ رتنّا ہے؟..... نہیں..... یہ رتنّا ہے.....؟ رتنّا ہے۔

چلو آگے بڑھو..... یہ کیا گنواروں کی طرح گھور ہے ہو.....؟ راحت صاحب نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔“

سلیم سچ مچ کا نپے لگا۔ اب مجھے ملیشمن پہچان لے گا۔

سنہرے بارڈر والی سفید دھوتی اور نیلے سلک کا کرتا پہنے۔ ملیشمن بھی مہمانوں کا استقبال کرنے باہر آ گیا تھا۔ وہ بھی  
اب پہلے سے موٹا ہو گیا تھا۔

سلیم جلدی سے راحت صاحب کی آڑ میں ہو گیا۔ پھر جب سب لوگ اندر جانے لگے تو وہ چپکے سے باہر کی طرف  
مڑ گیا اور جلدی جلدی گیٹ کی طرف جانے لگا.....“ اولٹ کے..... ادھر آؤ.....“ پیچھے سے کوئی چوکیدار سے پکار رہا  
تھا۔

کہ کہ کیوں؟ وہ گھبرا گیا..... شاید ملیشمن نے اسے پہچان لیا ہے۔ اب سب کے سامنے اسے جوتے مارے گا۔ گاؤں ”  
بھجوادے گا۔ بیلوں کی بجائے بنڈی میں جوتے گا۔ رات بھر سر پر پتھر رکھ کر کھڑا رہنے کی سزا دے گا.....“ ا جی تمہارے  
کو بیگم صاب بلا رئیں..... ادھر آؤ.....“ سلیم نے گھبرا کے پیچھے کی طرف دیکھا۔

بنگلے کے پیچھے چلو..... ادھر.....“ چوکیدار نے اندھیرے راستے کی طرف اشارہ کیا تو بیگم صاب نے اسے ”  
پہچان لیا۔ مگر میں نہیں پہچانتا۔ بھلا وہ رتنّا تھوڑی ہے۔ جس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے میں یہاں تک آ گیا۔ پھولوں بھرے  
راستے کا کاٹ کر ایک پھولوں بھرے خوشبودار پیڑ کے نیچے وہ اندھیرے میں جگنو کی طرح چمک رہی تھی۔ درخت پر شام  
.....ہونے کے باوجود کوئے چلا رہے تھے..... دونگلو.....دونگلو

“!سلیم..... تو یہاں کے آگیارے ”

ہاں..... یہ رتنّا کی آواز تھی۔ سلیم کو ایسا لگا جیسے وہ وینکٹی کے چوکے میں برتن مانج رہا ہے۔ اور رتنّا سوپ میں  
چاول لئے۔ چوکی پر میٹھی اس سے باتیں کر رہی ہے۔

میں تو کہیں آیا نہ گیا..... مگر تم کتنی دُور آگئے رتنّا..... تمہارے کو ہی دھونڈنے کو نکلا تھا میں..... اب بھی  
وہ نظر بھر کے رتنّا کو نہ دیکھ سکا کتنی خوبصورت لگ رہی تھی وہ۔ کتنی بدل گئی ہے۔ جیہی تو چیکٹ پلی میں اتنا اندھیرا  
چھا گیا تھا۔

تو..... تو میرے لئے آیا کیا؟ مجھے ڈھونڈنے“ رتنا نے تعجب سے پوچھا، پھر وہ سسکیاں لے کر بولی۔“

‘ ‘ مینتو سمجھی اب کوئی بھی میرے کو یاد نہیں کرتا ہوگا۔ میرا کون تھا جسے میری فکر ہوتی.....؟“

بیگم صاب..... آپ کو سرکار بلائیں“ ایک چپراسی نے آکر کہا۔“

رتنا..... کیا میں جاؤں؟ ہمیشہ کی طرح سلیم نے اجازت طلب کی تو یہ پرانی آواز سن کر رتنا کی چیخ نکل گئی۔“

تم جاؤ... میں آرہی ہوں.....“ رتنا نے چپراسی سے کہا۔ پھر سلیم سے بولی۔“

کل رات دس بجے تم یہاں آنا..... ملیشتم صبح شکار کھیلنے جا رہے ہیں.....“ یہ ہمارے گاؤں کا لڑکا ہے۔“..... ہمارے کھیتوں پر مزدوری کرتا ہے۔ میری ساس کا خط لے کر آیا ہے۔“ رتنا نے چپراسی کے سامنے سلیم کا تعارف ضروری سمجھا۔ پھر وہ اندھیرے میں یوں غائب ہو گئی جیسے سیاہ آسمان پر بجلی کا کوند الہراتا ہے۔

سلیم بڑی دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ سامنے کھلی کھڑکیوں سے ملیشتم اور اس کے دوستوں کے ہنسنے کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور تنّا ان کے بیچ میں ادھر سے ادھر تھرکتی پھر رہی تھی۔ کھڑی میں سے وہ لمبی سے میز بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ جس پر شراب کی بوتلیں اور گلاس رکھے تھے۔ بڑے سے کمرے میں سرخ قالین بچھا تھا۔ اُس پاس رانگین کرسیاں رکھی تھیں۔ تیز روشنی میں ملیشتم ہاتھ اٹھا کر اپنی شاعری سنا رہا تھا۔

سورج چمکتا ہے۔ میرے لئے

رات آتی ہے۔ میرے لئے

..... رات آتی ہے۔ میرے لئے۔ رات آتی ہے..... اور رات آگئی

جب سلیم باہر طرف جا رہا تھا تو اس نے دیکھا، تین چار نوکر مل کر ایک عورت کو باہر کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ مار رہے تھے۔ مگر وہ کسی طرح باہر جانے کو تیار نہیں تھی۔ چلا رہی تھی۔

اس کی صورت کو انگار لگو..... میرے کو پاگل بولنا وہ ماٹھی ملا۔ ٹھہر واس کاسر چھوڑ دوں گی۔ یہ میرا گھر ہے۔“

پاگل ہے۔ پاگل یہ عورت۔ صاب کے گاؤں والی ہے۔ وہاں کوٹھری میں ڈال دینے ہیں۔ مگر یہ سارا دن چلاتی ”.....“ ہے۔“ نوکروں نے سلیم سے کہا

“جاؤ..... تم آگے جاؤ..... یہ کسی کو مارتی نہیں۔“

مگر سلیم کے پانوں نہیں اٹھ سکے۔ یہ پاگل عورت ملیشتم کی بیوی راج لکشمی تھی۔ ملیشتم نے اسے پاگل مشہور کر دیا ہے یہاں۔

پھٹے ہوئے کپڑے پہنے۔ بکھرے ہوئے بال، ننگے پاؤں، بچاری کی کیا حالت ہوگئی تھی۔

یہ عورت سلیم کے خاندان پر سب سے زیادہ مہربان تھی۔ کبھی منہ سے کچھ نہ بولتی۔ ساس سے چھپا کر چاول، آٹا، مرچ، کھانا، ہر چیز سلیم کو دیتی تھی۔

یہ پاگل نہیں ہے۔ اسے مت مارو..... مگر پھر سلیم بولتے بولتے رُک گیا۔ اسے کوئی پہچان نہ لے یہاں۔ جتنی جلدی ہو سکے بھاگنا ہے۔

رات ہوئی..... رتنا میری راہ دیکھ رہی ہوگی.....“ سلیم کو بار بار یاد آ رہا تھا پھر وہ ملیشتم کے بنگلے کی طرف ” گیا۔ اندھیرے باغ کے بیچ میں وہ سفید بنگلہ چاندی کے موتی کی طرح جگمگا رہا تھا۔ اونچے اونچے درخت چاروں طرف گردن

اٹھائے جیسے پہرہ دے رہے تھے۔ یہ سب جن بھوت ہیں، جنہوں نے ایک شہزادی کو قلعے میں بند کر رکھا ہے۔ اب میں شہزاد بن کر اپنی تلوار سے ان سب شیطانوں کو قتل کر دوں گا۔ اور پھر شہزادی۔

یار ہم تو صرف مسز ملیشمن کے درشن کو جارہے ہیں ..... وہ جس چیز کو چھو لے وہ چیز نفیس ہو جاتی ہے..... بابا!..... (شراب کی بدبو میں ڈوبے ہوئے قبچہ ہے) سلیم کے دماغ میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ وہ گیٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر سر تھامے اکڑوں بیٹھا تھا۔ رتنّا اپنی مرضی سے آئی ہے۔ یہاں عیش کرنے۔ گاؤں میں بیوہ عورت کو کون رنڈیوں کی طرح مردوں کے بیچ میں بیٹھنے دیتا! پھر اس نے مجھے کیوں یا درکھا! بنگلے کی ساری کھڑکیاں آنکھیں کھولے میری راہ دیکھ رہی ہیں..... میں اس کا کون لگتا ہوں۔ اندھیری رات میں کل وہ میرے پیچھے پیچھے اتنی دُور تک آئی.....“ کل رات ضرور میں.....“ انا..... ملیشمن شکار کھیلنے جا رہے ہیں۔

ملیشمن چیکٹ پلی کے جنگلوں میں دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا ہوگا۔ جب وینکٹی

شکار کھیلنے جاتا تھا تو گاؤں کے سب لڑکوں کو بانیکے بن کر جنگلی جانوروں کو بانکنا پڑتا تھا۔

سلیم کو اس جنگل کی ہر راہ معلوم تھی۔ گھنے جنگل میں کوئی راستہ بھٹک جاتے تو عمر بھر نہ ملے۔ مگر اس گاؤں کے لڑکے ان جنگلوں میں کھیلتے تھے۔ باوا کھیتوں والے گھر کو رنڈیوں کے لئے صاف کرتا..... رتنّا اور پوشما ان کے لئے کھانا تیار کرتیں۔ خواجہ بی اور سلیم گرم گرم مزیدار مہکتے ہوئے کھانوں کی کشتیاں سر پر اٹھائے کھیتوں والے بنگلے جو جاتے تھے۔ خواجہ بی ان چمکتی دمکتی رنڈیوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتی تھی۔ منہ پر سرخی پاوڈر تھوپ کر جھلم کرتے..... کپڑے پہنے ہنس کر سب کو دیکھتی تھیں۔ رتنّا کی طرح

.....آخ تھو

دوسرے دن سلیم کو ایک لاری کا کلینر مل گیا۔ اسن نے اپنی ضمانت پر اسے رکشا دلوائی بات یہ طے ہوئی کہ اس کے بدلے وہ اس کلینر کو ہر مہینے دس روپے دیا کرے گا۔ اور پانچ روپے روز مالک کو دینا ہوں گے۔ باقی پیسوں میں عیش کردو بیٹا..... اب تو ٹھاٹ ہو گئے۔ رکشا چلانے کو مل جائے تو اور کیا چاہئے آدمی کو..... اپنے دل کا بادشاہ بن جاتا ہے وہ۔ نہ کسی سالے سیٹھ کی غلامی نہ وقت کی پابندی۔

جب تک ہاتھ پاؤں میں دم ہے رکشا کھینچو..... تھک جاؤ تو کسی سیندھی خانے میں موج مناؤ کسی بھٹیاری خانے میں کھانا کھاؤ۔ اور کسی گلی کے کونے میں رکشا کے اندر ٹانگیں سیکڑ کر لیٹ جاؤ۔ اب سونے کے لئے کسی ٹھکانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ بارش ہو رہی ہے تو کسی گھنے پیڑ کے نیچے رکشا کا پردہ اوڑھ کے سو گئے۔ ایسے مزے کے نیند آتی ہے..... کبھی خواب میں کٹے ہوئے بالوں والی چمکتی دمکتی رتن آتی۔ ہاتھ میں جھوٹے چاولوں کی پترولی لئے۔ کبھی مالنّ بی کی سسکیوں سے آنکھ کھل جاتی۔ یوں لگتا جیسے اماں پاس سو رہی ہو۔ بھابی کے بچے کے رونے کی آواز..... مراد بھائی کی کھانسی..... جانے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا..... چار مہینے سے گھر کو پیسے نہیں بھیجے۔ گئے اور جوار کی فصلیں کٹ چکی ہوں گی۔ مراد بھائی نے خط لکھا تھا اماں بیمار ہے۔ غوثیہ کا پیغام آیا ہے۔ غوثیہ اتنی بڑی ہو گئی ؟

.....ملیشم شکار کھیلنے گیا ہے..... کہیں وہ اب غوثیہ کو

لو.....لو اب نیند کہاں..... ؟ آنکھوں میں جیسے کسی نے مرچیں بھر دیں

ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ جب بھی خواب میں اماں آتی تھی وہ چھوٹے بچوں کی طرح

رونے بیٹھ جاتا۔

! مسجدوں میں اذان ہو رہی ہے..... یا اللہ میں کیا کروں

.....چلو اسٹیشن کی سواریاں لانے

.....دن میں ایک بارہ ملیشم کے بنگلے کی طرف سے ضرور گزرتا تھا

آج وہ جیسے ہی بنگلے کے سامنے رُکا ، اندر سے ایک سفید موٹر نکلی۔ موٹر ملیشم چلا رہا تھا۔

رتنا اس کے پاس بیٹھی تھی..... سرخ ساری ، سرخ ہونٹ سرخ ہٹو۔

سلیم کو چیکٹ پلی کے گل مہر کے درخت یاد آ گئے۔ جب ان میں پھول کھلتے ہیں تو جیسے سارا جنگل سرخ ہو جاتا تھا۔ ان کے عکس سے زمین و آسمان سرخ لگتے۔ سلیم کی آنکھوں میں وہ سرخی آج بھی بھر گئی۔ جیسے حیدر آباد کی ہر عورت نے آج سرخ ساری پہنی تھی..... ہر طرف سرخ رنگ گھلا ہوا تھا..... دوبار پولیس والے نے اسے غلط راستہ پر ٹونک دیا..... ایک بچے سے ٹکر ہوتے ہوئے بچی۔

گھبرا کے اس نے ایک گھنے درخت کے نیچے رکشا رو کی تو رکشا میں اخبار ”سیاست“ پڑا تھا..... ابھی اُترنے والے صاب اخبار ساتھ لینا بھول گئے تھے شاید۔ رکشا کی سیٹ پرسرلٹکا کے وہ آڑا لیٹ گیا اور اخبار پڑھنے لگا۔

کمیونسٹ پارٹی نے مسلح جدو جہد واپس لے لی..... حکومت نے پارٹی پر سے پابندی اٹھالی..... کیوں..... کیوں ہتھیار واپس کر دئیے۔ سلیم کو غصہ آگیا۔

یہ بشیر علی تو ڈرپوک آدمی نکلا۔ اتنی باتیں بناتا تھا۔ اب ملیشم گاؤں والوں کو خوب ستائے گا۔ وہ تو کمیونسٹوں کے ڈر سے شہر آ گیا تھا۔ پولیس والے تو اس کے دوست ہیں۔ ایک مرغی..... گاؤں کی ایک لڑکی..... بس دو چیزیں حوالے کر دو، ..... کسی پولیس والے..... ملیشم تو ان کاموں میں خوب استاد ہے۔ اب بچارے مراد بھائی کی اور شامت آگئی۔

ایک دن سلیم ایک صاب کو رکشا میں بٹھا کر دفتر لے جا رہا تھا۔ وہ صاب راستے بھر اخبار کھولے پڑھتے رہے۔

صاب آج اخبار میں کیا خبر ڈالے.....؟ کمیونسٹاں کہتے اپنی بندو خاں

‘ ‘ ..... پولیس والوں کو دیدئیے تا

باؤ..... اب وہ لوگاں بھی کتے الیکشن میں کھڑے ہوں گے۔ ووٹ لے کر حکومت بنا ئیں گے کتے..... لڑائی ”جھگڑے ختم کر دئیے کتے۔“

سچی؟ پھر تو سب گاؤں والے مخدوم صاب کو ووٹ دیں گے۔ سلیم خوش ہو گیا۔

کیوں.....؟ مخدوم صاب کو ووٹ کیوں دینا؟“ ان صاب نے پوچھا۔

پھر کیا کرنا صاب۔ ہمارے گاؤں کے جاگیر دار سا ہو کار۔ بھوت خراب آدمی ہیں۔ ہم لوگوں کو بھوت ستاتے صاب۔ وہ ”لوگاں پولیس سے نیں ڈرتے۔ صرف مخدوم صاب سے ڈرتیں۔“

مگر اب تو کانگریس کی حکومت آگئی ہے۔ وہ نظام کے زمانے کے سسٹم ختم ہو گیا۔ اب تو پنڈت نہرو، جاگیرداروں، ”ساہوکاروں سے ان کی جائیداد لے رہے ہیں۔ سب غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ تم لوگاں کا نگرہس کو ووٹ کا دینا۔ کمیونسٹاں تو غنڈے ہیں۔“ وہ صاحب رکشا سے اُتر کے آفس میں چلے گئے۔

ساہوکاروں، جاگیرداروں سے جاگیریں چھین لے رہے ہیں۔ سب غریبوں میں بانٹ دیں گے..... لوسلم میاں، اب ” ‘ ‘ ..... اپنے تو ٹھاٹ ہو گئے۔ اب تو ملیشم کی پھوکت میں غلامی بھی نہیں کرنا پڑے گی

اس خوشی میں وہ فوراً ایک سیندھی خانے میں گھس گیا..... آدھی بوتل پینے کے بعد اسے ایک فکر نے آن گھیرا..... مگر یہ کانگریس والے ملیشم کو الیکشن میں کیوں کھڑا کر رہے ہیں.....؟... کوئی کانگریس لیڈر ملے تو سلیم..... اسے یہ بات بتانا چاہتا ہے

رکشا کھینچنے سے اس کے سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ راتوں کو کھانستے کھانستے آنکھ کھل جاتی..... شہر میں الیکشن کا شور بڑھ گیا تھا۔ ہر طرف پارٹیوں کے جھنڈے لہراتے۔ ہر میدان میں جلسے ہوتے۔ سلیم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا !..... کہ وہ کانگریس کی طرف داری کرے یا مخدوم صاب کی

کانگریس والے تو کتے اب کسانوں کو زمینیں اور بیل دیں گے۔ جاگیرداروں سے جاگیریں چھین کر غریبوں میں بانٹ ” دیں گے۔ مگر بشیر علی کے لوگاں تو چپ مارم پٹی بھوت



!.....کرتے۔ اپن چپ بیٹھ کو تماشہ دیکھنا۔ اب کیا ہوتا کی

الیکشن کے جلسوں میں جہاں بھی سلیم سواری لے کر جاتا تھا۔ رکشا ایک طرف کھڑی کے خود بھی لیڈروں کی تقریریں سننے کھڑا ہو جاتا تھا۔ کانگریس کے لیڈر کہتے تھے کہ وہ عوام کے ساتھ انصاف کریں گے۔ سب امیر غریب برابر ہیں۔ کمیونسٹ کہتے تھے کانگریس تو سیٹھوں اور سرمایہ داروں کی ساتھی ہے۔ ان کے دھوکے میں مت آنا۔

لو، الیکشن کے نتیجے آگئے۔ ہر طرف کانگریس والے جیت گئے چیکٹ پلی سے ملیشمن جیت گیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب سرکار اس کی زمینیں تو چھین لے گی۔ مراد بھائی کو زبردستی اس کا کام نہیں کرنے پڑے گا۔ ہمیں بیل اور بیج ملیں گے۔ اماں آجکل بہت خوش ہو گی۔ اب جاؤں گا گاؤں کو۔ مراد بھائی کے ساتھ اپنے کھیتوں میں کام کروں گا۔ کسی سالے کا ڈرنیں.....رہا۔.....خوب محنت کریں گے سب مل کر

گھر جانے کی تیاری کرتے کرتے ایک برس گزر گیا۔ بیج میں وہ بار بار بیمار ہو جاتا۔ رکشا میں پڑا رہتا تھا۔ تیز بخار.....کھانسی.....جب کماؤ نہیں تو علاج کے لئے پیسے کہاں سے آئیں۔ مالک روز صبح گالیوں سے نواز کے چلا جاتا تھا.....رکشا کے مالک کے پتے پر مراد بھائی کا ایک مخط آیا تھا۔

”گاؤں میں سب کو بیل اور زمینیں ملنے والی ہیں۔ میں نے بھی درخواست دی ہے۔“

مگر اب تو ایک برس ہو گیا۔ گھر کی کوئی خیر خبر نہیں۔ اماں سمجھتی ہوگی مجھے شہر کی ہوا لگ گئی.....خوب ٹھاٹھ کر رہا ہوں۔ سب کو بھول گیا۔

غوشیہ بی کی شادی ہوگئی ہوگی.....بھابی کے بچے بڑے ہو گئے ہوں گے سات برس ہو گئے گاؤں سے نکلے ہوئے.....

گاؤں والی بس جب چیکٹ پلی کے قریب جارہی تھی تو ایک سوندھی سی خوشبو نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جنگل کی مہک، چیکٹ پلی کی تازہ ہواؤں کی یو نے اسے پھول کی طرح کھلا دیا۔ ”گل مہر“ کے پیڑوں سے پھول اور پتے جھڑ چکے تھے۔ کھیت سنسان پڑے تھے۔ گاؤں والے اسی طرح مریل چال چلتے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا.....چیکٹ پلی کا اندھیرا، جو اچانک سارے گاؤں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ پھر ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دیتا۔ لوگ اندھیرے.....میں ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں

سلیم کی طرح..... مگر کوئی راستہ نہیں ملتا۔

دُور پہاڑیوں کے اوپر پوچما کے دیول کی سرخ لانیٹ جگمگا رہی تھی۔ سلیم کو یوں لگا جیسے پوچما بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے سلیم کو گھور رہی ہے۔ بے اختیار اس نے ہاتھ جوڑ کر پوچما کو سلام کر لیا۔ ( اماں کہتی تھی پوچم بڑے جلال والی دیوی ہے۔ اسے کبھی خفا نہیں کرنا چاہیئے۔

سارے گاؤں میں اندھیرا چھا چکا تھا۔ بس اسٹانڈ پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ مگر سات برس بعد آنے والے سلیم کو کسی نے نہیں پہچانا۔

گھر کے دروازے پر پاؤں رکھ کر اس نے اندر دیکھا۔ چراغ کی دھندلی روشنی میں ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ گیا تھا۔ دالان میں وہی مریل سی بکری بندھی ہوئی تھی۔ چھپر سے لٹکتے ہوئے چھینکے پر وہی اچار کی بانڈی رکھی تھی۔ موری کئے بیٹھا وہ بچہ ابھی تک ہگ دیا تھا۔ جسے یوں ہی بگتا ہو اسلیم چھوڑ گیا تھا۔ دالان میں سب بیٹھے حسب عادت لڑ رہے تھے۔ اماں سب کی طرف سے منہ پھیرے ایک کونے میں گوڈر میں لپٹی پڑی تھی۔

اماں.....اماں میں آگیا۔“ وہ خوشی کے مارے زور سے چلایا۔“

سلیم...؟ سب ایک ساتھ بولے۔“

کون ہے.....کس کی آواز آئی.....؟ اماں بڑ بڑا کے اٹھ بیٹھیں۔“

میں سلیم ہوں اماں..... میری اماں۔“ وہ اماں سے لپٹ گیا۔ اماں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ اماں کے بعد وہ مرادؔ بھائی سے ملا۔ مرادؔ بھائی نے داڑھی رکھ لی تھی۔ سفید داڑھی، جھکی ہوئی کمر ، سوکھا کانتا۔ ساٹھ برس کا بوڑھا لگ رہا تھا وہ۔ مرادؔ بھائی ، اماں، چولہے کئے بیٹھی جوار کی روٹی پکانے والی نورآ بھابی..... سب رونے لگے۔

تیری کیا حالت ہوئی رے..... کیا کوئی بیماری لگ گئی تھے.....؟“

مرادؔ بھائی بار بار اسے دیکھ رہا تھا۔ اماں ہاتھوں سے اس کے بدن پر گوشت تٹول رہی تھی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا گھر جاتے ہی گالیاں پڑیں گی۔ مرادؔ بھائی پر اتنا بوجھ ڈال کر وہ خود شہر میں مزے کرتا رہا..... یہاں گھر کی کیسی بری حالت ہوگئی۔ نورآ بھابی کتنی دہلی ہوگئی ہے۔ چھٹی ساری سے سر چھپائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ایک زمانے میں بھابی کتنا ہنستی تھی۔ جس بات پر اسے رونا چاہیئے اس پر بھی ہنسنے جاتی۔ چاہے مراد مارے یا ساس گالیاں دے اسے ہنسنے سے کام تھا۔ مگر آج اس نے جیسے اپنے ہونٹ سی لئے تھے۔

سلام الیکم بھائی..... کیسے ہیں جی تم.....؟“

و الیکم سلام.....“ اس نے گردن جھکالی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

“تم کا بے کو آئے یہاں..... ملیشم ریڈی بولتا تم آئے تو دس برس تک کام کراؤں گا۔“

ارے چھوڑ ! اس سالے سے اب ڈرنا۔ اب اپن لوگوں کو کوئی زبردستی کام نہیں کروا سکتا..... میں شہر سے سب خانوں معلوم کر کے آیا ہوں۔ اس نے بڑی شان سے دیوار سے سر لگا کے چار مینار سگریٹ سلگایا۔

وہ شہر کے خانوں و بیچ رہنے دو۔ یہاں تو اپنا پرانا خانوں چل را۔ باوا جو رو پیہ اُدہار لئے تھے وہ واپس کرنانیں کرے تو سا ہو کار پھوٹ میں کام لیتا۔ تو کیوں آیا یاں۔ جلدی سے بھاگ جا۔ نہیں تو سا ہو کار پکڑ لیں گا۔

کیا ؟ سلیم نے تعجب سے منہ کھول دیا۔

“تو کیا ہمار قرض معاف نہیں ہوا؟ تم تو خط میں لکھے تھے بیل، بیج ملنے والے ہیں۔“

‘ ‘ .....ہنو ملے تھے..... غوثیہ بی کی شادی کر دیئے

‘ ‘ غوثیہ کی شادی ہوگی؟“

“ہنو.....جیتا پور میں دیئے۔ چھوکر اینٹوں کی بھٹی پر مزدوری کرتا ہے۔“

تو بیل ملے..... بیج بھی ملے کیا .....؟ سلیم خوش ہو گیا۔

ہو.....اپنے کو بیل ملے۔ کھیتوں میں ڈالنے کے بیج ملے۔ گاؤں کے بھوت لوگوں کو ز میں دیئے.....“ مرادؔ نے منہ لٹکا کے کہا۔

سچی.....؟ سلیم خوشی کے مارے اُچھل پڑا۔ یہ کانگریسی لوگاں سچی بولے تھے.....“ تو اپنے کوز مین کیوں ” نئیں دیئے.....؟

ارے جن لوگوں کے پاس زمین نئیں تھی ان کو ملیشم ریڈی زمین دلوا دیا۔ ہمارے پاس زمین تھی بول کے ہمارے بیل ” “دیئے۔ بیج دیئے۔ چار ہزار کے بیل تھے۔ اب ہر فصل پر پانچ سو روپے سرکار کو دینا ہے۔

اچھا.....! تو کیا ادھار دئے تھے.....“ سلیم کی خوشی مدھم پر گئی۔

“شہر میں تو سب لوگاں بولے کتے ووٹ مانگنے والے گاؤں میں جا کر پھوٹ میں کھیت دیئے۔ بیج دیئے۔ بیل دیئے۔“

ہو..... وہ سچی بات ہے.....“ مراد نے اپنا پگڑی والا سر بلا کر کہا۔“

تو پھر اور کیا چاہیے ! بیل زمین مل گئی۔ اناج بونے کے لئے بیج مل گیا۔ پھر بھی مراد بھائی سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ پورے گاؤں پر ہی نحوست چھانی ہوئی ہے۔ نوراً بھابی ابھی تک پھٹی ہوئی ساری سے سر چھپانے بیٹھی ہے۔ اماں کی جان کو جانے کتنے روگ لگے ہیں۔ یہ گاؤں والے کبھی خوش نہیں ہوں گے۔ قاسم پہلوان رکشا والا سچی بولا تھا۔

اپنے کھیت میں تو اب اچھی پیک (فصل) آرہی ہوگی۔ بیل کہاں ہیں...؟ سلیم

نے پوچھا۔

بیل بیچ کر غوثیہ کی شادی کر دی.....“ مراد نے سر جھکا کر کہا۔“

اب چار ہزار روپے سرکار کو دیتا ہے۔ ہر فصل پر پانچ سو روپے ادا کرنا ہے سب لوگ ایسا ہی کرے۔ بیل بیچ ”دیئے۔ دس کام رُکے ہوئے تھے۔ بازار میں بیچو تو بیلوں کی قیمت چھ ہزار آتی ہے۔ مگر ملیشم با ہر سودا نہیں کرنے دیتا۔

کیوں.....؟ کیوں نہیں کرنے دیتا.....؟“

اسی شرط پر تو وہ بیل دلاتا ہے سرکار سے کہ ہم بیل اسی کو بیچیں گے۔ ہر فصل پر اناج بھی اس کو دینا پڑتا ”ہے۔“..... سلیم کا خون کھولنے لگا۔ مگر وہ بھائی کی پوری باتیں صبر کے ساتھ سنتا رہا۔

دو برس سے اچھے برستا تاں نیں ہوری..... پیک (فصل) اچھی نیں ہوری غفور اور خاجو محنت مزدوری کر کے ”گھر چلاتے ہیں۔

اور تم..... تمہیں تو اب ملیشم کی پھوٹ کی مزدوری نیں کرنا پڑتی نا...؟ سلیم نے گھبرا کے پوچھا۔“

ہم لوگ تو اسی کے کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔ انے کسی کو نہیں چھوڑا۔ بولتا کوئی

سرکاری خانوں نہیں بنا کتے کہ رہن والے مزدوروں کو چھوڑ دو۔ تیرے جانے کے بعد میرے کو بھوت مارا..... تو پھر کیوں آیا ‘ ‘ گاؤں کو.....؟

سلیم چپ چاپ بیٹھا مراد بھائی کو گھورے جارہا تھا۔ گہری رات کا اندھیرا اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ سب بچے شہر کے تحفے دیکھنے کے انتظار میں جاگتے جاگتے سوچکے تھے۔ نوراً بھائی بھی وہیں ایک طرف پڑی سو رہی تھی۔ صرف اماں جاگ رہی تھی۔ ڈور جنگلوں کی طرف کتے بھونک رہے تھے۔ پڑوس میں کوئی مرد اپنی عورت کو مار رہا تھا۔ عورت کی چیخوں سے سارا محلہ گونج رہا تھا۔

اُجاڑ صورت..... تیری صورت کو انگھار لگو۔ اڑھائی گھڑی کی موت آؤ۔“

”اگے میری اماں..... میں اب کال جاؤں رے..... موت بھی نیں آتی نا۔

سلیم کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے بھی جوتوں سے خوب پیٹا ہے۔ وہ گھٹتوں میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔ اماں اور مراد اس کے قریب سرک آئے۔

تو کیوں روتارے۔ ہم لوگ یاں ٹھیک ہیں۔ تو کتنا دبلا ہو گیا۔ اچھا کھا پی کر مزے میں رہنا..... اپنی جان کو ”ہماری فکر کیوں لگالیا۔

مراد بھائی کتنا ظرف والا تھا۔ خود اتنی مصیبتیں اٹھا رہا تھا۔ اور اس سے کہہ رہا تھا کہ مزے کرو۔

میں اب شہر کو نہیں جاتا۔ یہیں محنت مزدوری کروں گا.....“ اس نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھنے۔“

نکونکو.....تو ابھی شہر چلا جا.....یاں تیری جان کے دشمن ہیں لوگ۔ پہلے بولے تو دلم (چھاپہ مار دستے) میں ”  
مل گیا ہے۔ ملیشمن تیرے کو بھوت ڈھونڈا۔ اب تو گاؤں آگیا بول کے معلوم ہوا تو تجھے بھوت مارے گا۔ تجھے بھی میری طرح  
”اپنے کام پر لگادے گا۔“

نہیں نہیں۔ میں اب سلیم کو نہیں جانے دوں گی.....“ احمد بی سلیم سے چمٹ کر رونے لگی۔

میں مر جاؤں گی۔ اب میں اسے نہیں جانے دوں گی.....“ سلیم بھی رور ہا تھا۔

اماں ! اسے جانے دے.....“ مراد نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔

‘ ‘ تو بھول گئی کیا۔ ابو چچا کے بیٹے کو چوری کا جھوٹا الزام لگا کے جنگل میں مار کے ڈال دیا۔“

اچانک اماں نے جیسے انگاروں کو چھو لیا۔ اس نے جلدی سے سلیم کو چھوڑ دیا اور خوف سے کانپتے ہوئے بولی۔

ہو... چلا جا بیٹا..... کہیں تجھے بھی کوئی پولیس والا نہ مار ڈالے۔“

نیں اماں، میں تیرے کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ چاہے میری جان چلی جائے۔“ سلیم

نے غصہ میں کہا۔

کیا پاگل ہوا ہے تو.....؟“ مراد گھبرا گیا

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو گاؤں آنے والا ہے تو آنے ہی نہ دیتا۔ اماں کا کیا ہے وہ تو ایسے چ روتی ہے۔ تو شہر میں ”  
گھر لے کر اماں کو اپنے پاس بلا لینا۔ بس اب چلا جا... صبح ہوئی

”تو پورے گاؤں والے دیکھ لیں گے۔“

ابھی.....؟ آج ہی.....؟ سلیم نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر مراد کو دیکھا... روتے ہوئے سلیم کی صورت مراد  
سے دیکھی نہ گئی۔ اور یہ پیچھے کی طرف مڑ گیا۔

اماں، جلدی سے اسے کچھ کھلا دے۔ سفر سے آیا ہے۔ نو رآ سوگئی کیا؟ اور پھر وہ خود ہی آنگن پار کر کے چولہے ”  
کنے ہانڈیاں کھنگالنے چلا گیا۔

جب سے ملیشمن نے نورآ کو پکڑا تھا۔ نورآ تیرے بھائی سے بات نہیں کرتی۔ بولتی کتے یہ

چھوٹا بچہ ملیشمن کا ہے۔ کیا کرنا ممنا کی ماری پال رہی ہے۔

تیرے بھائی کو بھوت ڈکھ ہیں رے۔ چپ سر پکڑ کے بیٹھارہا ہے۔ کسی کو کچھ نہیں بولتا۔

جب تک مراد واپس آئے ، اماں اس کے کان میں کھسر پھسر کرتی رہی۔

لے... روٹی بھی ہے اور کیری کی چٹنی بھی.....“ مراد بے حد خوش خوش جوار کی سرخ روٹی ہاتھ میں لئے آیا ”  
.....اور سلیم کو تھمادی

سلیم نے روٹی کو غور سے دیکھا۔ لال جوار کی روٹی اور کیری کی چٹنی کھانے کتنے برس بیت گئے..... وہ  
شہر میں اس روٹی کو کتنی بار یاد کرتا تھا۔ مگر اس وقت حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ یوں لگتا اب قئے ہونی والی ہے۔

تھوڑا پانی پی لے.....“ ماں سمجھ گئی ، اس سے سوکھی روٹی نہیں نکلی جاری ہے

”تجھے شہر میں جوار کی روٹی کھانے کی عادت نہیں رہی ہے نا۔“

ہاں شہر کے بوٹلوں میں تو باریک چاول کی بریانی ملتی ہے۔ بکری کا گوشت“ مراد“

بھائی نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔

‘ ‘ ..... بس اب جلدی سے کھا کر تو ابھی چلا جا

کہاں جاؤں.....؟ مگر یہ بات سلیم نے مراد سے نہیں پوچھی۔

اس کی تھکن اور بڑھ گئی۔ اس نے مڑ کے اپنے صندوق کو دیکھا۔

”بھائی۔ اس میں بھابی اور اماں کے لئے ساریاں ہیں۔ تمہارے لئے لنگی اور بیچوں کے لئے۔“

ادھر لا..... میں دیکھوں.....“ اماں گھبرا کے انھی اور صندوق کو کھولنے لگی۔

”ابھی نکو کو اماں..... پہلے سلیم کو جانے دے۔ صبح اُجالا ہو گیا تو لوگوں اس کو دیکھ لیں گے۔“

کتنا ظالم ہے مراد بھائی، اپنے دالان میں ذرا اوپر بیٹھنے بھی نہیں دیتا۔ یہاں بیٹھنے کے اس نے کتنی بار خواب دیکھے تھے۔ اپنے گاؤں کو اُجالے میں دیکھ تو لیتا۔ غفور اور خاجو جانے کتنے لمبے ہو گئے ہوں گے۔ نورآ بھابی کے دل میں گھر والوں کی جانے کتنی شکایتیں اکھٹی ہو گئی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ اپنے شوہر اور ساس کی شکایتیں اس سے کر کے اپنا جی ہلکا کرتی تھی۔ آج تو اس نے سلیم سے بات تک نہیں کی۔ اب وہ اپنے شوہر کو بھی اپنے بدن کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی..... نورآ بھائی اتنی مضبوط ارادے والی ہوگی، اسے تو کبھی انداز نہیں ہوا تھا..... وہ اپنے آپ کو اتنی بڑی سزا دے رہی تھی۔ اس گھر میں سب کتنا دکھ اٹھا رہے تھے۔ جیہی تو مراد بھائی کہہ رہا ہے تو شہر جا کر مزے کر۔

.....اماں میں جا رہا ہوں اماں“..... وہ روتے روتے جا کر اماں کے پیروں سے لیٹ گیا“

میں تجھے شہر بلالوں گا۔ مراد بھائی کو بھی۔ اپن سب مل کو وہاں رہیں گے۔ جانے وہ یہ باتیں اماں سے کہہ رہا تھا۔ ”یا اپنے آپ سے۔ جب وہ مراد کے ساتھ گھر سے باہر آیا تو گھورا

اندھیرا جیسے اس کی تاک میں بیٹھا تھا..... آج جیسے گاؤں کے ہر گھر کا چراغ بجھ چکا تھا۔ مارچ کی اس اماوس کی رات، آسمان بھی اندھیرے میں ڈوب چکا تھا..... دُور پوچھا کے دیول کی سرخ روشنی اس کی رہبر بنی کھینٹوں کا راستہ ختم ہوا تو آگے بس اسٹاپ آنے سے پہلے مراد رک گیا۔

آگے خطرہ ہے۔ ممکن ہے بس اسٹاپ پر کوئی جان پہچان والا میرے ساتھ تجھے دیکھ کر پہچان ہے۔ جا، اور آگے ”چلا جا۔ دوکوس اور چل کر بس میں سوار ہونا۔“

سلیم نے مڑ کے دیکھا..... مراد بھائی اس سے ملے بغیر تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا..... سلیم نے آنسو بھری آنکھوں سے ادھر دیکھا۔

یہ اچھا ہی ہوا..... ورنہ وہ اگر رخصت ہونے سے پہلے گلے ملتے تو پھر انہیں الگ الگ کون کرتا.....؟

ایک دن اُردو ہال میں کوئی جلسہ ختم ہوا تو سلیم سواری ملنے کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔

بہت سے لوگ باہر نکل رہے تھے۔

پھر مخدوم صاب آئے۔ لوگ انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ میلا سا پینٹ بش شرٹ، معمولی سی چپل پہنے، وہ ہنس ہنس کر سب سے باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ سلیم انہیں دیکھ رہا تھا۔ بار بار اس کا جی چاہ رہا تھا وہ بھی مخدوم صاحب کو سلام کرے۔

پھر وہ جانے کس کشش کے سہارے آگے بڑھتا گیا۔

سلام صاب..... اس نے مخدوم صاحب کے سامنے جا کر جھک کر سلام کیا ..... ”سلام..... کیسے ہو “ دوست..... ؟“ مخدوم نے آگے بڑھ کر اس سے

باتھ ملایا۔

دوست.....؟ مخدوم سے اس کی دوستی کب ہوئی..... ؟ سلیم نے تعجب

سے سوچا اور پھر گھبرا گیا۔ اب کیا کہے۔

صاب میری رکشا ہے داں۔ آپ کو کہیں جانا ہوتو .....“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

نہینہیں..... پیدل ہی ٹھیک ہے۔“ مخدوم اسے سلام کر کے آگے بڑھ گئے۔ پیدل ہی ٹھیک ہے۔ پیدل چلتے چلتے ” مخدوم نہیں تھکتے۔ سب تھک گئے۔ وہ مخدوم کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کا کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

نرسی.....؟ نرسی کے ساتھ بشیر علی بھی تھا۔

وہ نرسیا کے گلے سے لپٹ گیا۔ نرسیا اب کتنا بدل گیا تھا۔ پینٹ بش شرٹ پہنے۔ ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ پورا ” شہر کا صاب بن گیا تھا وہ۔

تو اُٹا دبلا ہو گیا سلیم..... شہر کب آیا .....“ نرسی نے بڑی محبت سے اس ”

کے ہاتھ تھام لئے۔

میں سات برس سے شہر میں ہوں ، رکشا چلاتا ہوں ، سلام علیکم بشیر علی بھائی اس نے بشیر علی کو سلام کیا۔ ” بشیر علی نے اسے غور سے دیکھا، جیسے یاد کر رہا ہو کہ یہ کون ہے؟

میں چیکنٹ پلی والا سلیم ہوں۔ کیا بھول گئے میرے کو بھائی.....؟“

او ہو..... سلیم..... بشیر علی نے ہاتھ ملایا۔

‘ ‘ بھوت دبلے ہو گئے۔ کیا بیماری ہے؟“

‘ ‘ بیمار؟ سلیم سوچنے لگا۔ اس بیماری کا کیا نام ہے جو مجھے کھائے جارہی ہے؟“

“طبیعت ٹھیک نہیں رہتی بشیر بھائی۔ رکشا چلانے سے چھاتی میں درد ہوتا ہے رات بھر کھانسی آتی۔“

تم رکشا چلانے لگئے “؟ بشیر علی نے اسے غور سے دیکھا۔

“رکشا چلانا چھوڑ دو۔ کسی ڈاکٹر کو دکھاو۔“

پرسوں گاؤں گیا تھا۔ سات سال کے بعد“ سلیم نے نرسیا سے کہا۔

“ہاں گاؤں میں سب کیسے ہیں۔؟ میری اماں تو مر گئی۔ جب میں جیل میں تھا۔“

‘ ‘ نرسی اچانک اداس ہو گیا۔“ تو میرے گھر گیا تھا کیا؟ انا (بھائی) سے ملا؟

نیں..... میں تو اپنے گھر کے بچوں کو بھی نہیں دیکھا۔ مراد بھائی اسی رات کو مجھے

“چلے جاؤ بولے۔ کتے ملیشمن ریڈی ابھی تک مراد بھائی سے پھوٹ میں کام لے رہا ہے۔ رامیا انا بھی کام کر رہا ہے۔

ہو..... بڑے مدمعاش ہیں یہ سابوکاراں۔ غریبوں کو لوٹنے کے دھندے ان کو آتے ہیں۔ خوب لوٹیں گے ہمارے ” کو۔

بشیر علی کے ساتھ دو اور آدمی تھے ۔ انہوں نے کہا۔

چلو کسی ہوٹل میں چائے پئیں گے..... سب جاکر ایک چائے خانے میں

بیٹھ گئے۔ اور پھر وہ آپس میں زوردار بحث کرنے لگے۔ کبھی اُردو میں کبھی تلگو میں۔ کبھی انگلش میں بولتے۔ بشیر علی سب سے زیادہ چلا رہا تھا۔ وہ غصہ میں بار بار میز پر مگا مارتا تو پیالیوں کی چائے چھلک جاتی۔ نرسیا بھی اب کتنا قابل ہو گیا تھا۔

چیکٹ پلی کا وہ نرسے ، جس کا منہ کالا کر کے گدھے پر بیٹھا کے ملیشمن نے سارے گاؤں میں گھمایا تھا۔ اب کتنی بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔ سلیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ کبھی بشیر علی مخدوم کا حوالہ دیتا۔ کبھی کانگریس کی باتیں کرتا۔ اور بار بار دھمکیاں دے رہا تھا۔ کہ وہ سب کے ساتھ کام نہیں کرے گا۔

جب بارہ بج گئے تو ہوٹل کے مالک نے انہیں اٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ سب ہوٹل سے نکل کرفٹ پاتھ پر جا کر کھڑے ہوئے۔

میں جنگم بستی میں رہتا ہوں۔ کسی دن مجھ سے ملنے آنا۔“... نرسے نے اچانک سلیم کو دیکھا تو شرمندہ ہوا کہ اسے ” سلیم کی موجودگی کا خیال نہ رہا۔

ہاں تم کل صبح میرے پاس آؤ۔ میرا پتہ یہ ہے..... بشیر علی نے بھی اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتے کرتے رُک کر ” سلیم سے کہا۔ سلیم سمجھ گیا۔ وہ لوگ سلیم کی موجودگی سے بور ہو رہے ہیں۔ بشیر علی کا پتہ جیب میں ڈال کر اس نے اپنی رکشا آگے بڑھائی۔

صبح وہ اسٹیشن پر سواری ڈھونڈنے کی بجائے۔ بشیر علی کا گھر ڈھونڈنے نکالا۔ وہ کسی کے گھر کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ فرش پر ایک میلی دری بچھی تھی۔ سرہانے ایک میلا چیکٹ تکیہ پڑا تھا۔ ایک کونے میں صراحی رکھی تھی۔ ایک کونے میں میز پر بے شمار کتا ہیں اوندھی سیدھی پڑی تھیں۔ کھونٹی پر کپڑے لٹک رہے تھے۔ اس کی حالت تو کچھ نہیں بدلی۔ لوگ کہتے ہیں۔ اس نے بڑے سیٹھوں، سابوکاروں کے گھر ڈاکے ڈالے ہیں۔ بہت سونا چاندی لوٹا ہے..... وہ پیسہ کہاں گیا۔

ایک بار بشیر علی نے بتایا تھا۔ گاؤں میں اس کی منگیت رہے۔ سلیم تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ وہ کسی بھرے گھر میں جائے گا آج، جہاں بشیر علی کی بیوی سونے چاندی کے زیور پہنے۔ بچوں میں گھری بیٹھی ہو گی۔ مگر اس کے کمرے میں تو کسی عورت کا خیال تک نہ تھا بشیر علی الماری میں سے آئینہ اور شیو کا سامان لے کر لنگی اور بنیان پہنے۔ دری پر آ کے بیٹھ گیا۔

اب سناؤ کیا حال ہے تمہارا۔ میں کتے وخت بولا۔ میرے ساتھ آ کے کچھ کام کرو۔“

“مگر ایسا لگتا ہے بیٹا تمہیں شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔ تم سیندھی اور عورت کے چکر میں آگئے ہو۔

گالوں کو صابن لگانے میں بشیر علی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گردن جھکا کے سر کھجانے لگا۔ شاید اس نے بھی سلیم کو سیندھی خانے میں یا محبوب کی مہندی میں دیکھ لیا ہے بڑا تیز ہے یہ آدمی۔ صورت سے کیسا ہوا ( بے وقوف) نظر آتا ہے۔

نہیں بشیر بھائی، ایسی بات نہیں ہے۔ رکشا چلانے سے چھاتی میں درد ہوتا ہے کیا کروں۔ بھائی کو گاؤں پیسے ” ،.....رہتے ہیں۔ گاؤں میں سابوکار نے میرے بھائی کے رہن کی مدت اور بڑھادی ہے۔ چھوٹے بچے ہیں۔ اماں بیمار ہے

بس سا ہو کا رہن کی معیاد بڑھاتا جائے گا۔ تم رکشا کھینچتے رہو۔ بشیر علی نے بڑی غصہ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ تیز استرے کو اپنے چہرے پر اتنی تیزی سے چلا رہا تھا جیسے کسی دشمن کی کھال کھینچ رہا ہو۔

پھر کیا کروں آپ ہی بتاؤ نا۔“ سلیم نے روتی صورت بنا کے کہا۔“

کوئی روپے لئے بغیر نوکری نہیں دیتا۔ سب لاری کے سیٹھ مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ میں ایک لاری کی نوکری چھوڑ ” “دیا بول کے اب کوئی لاری والا سیٹھ میرے کو نوکری نہیں دیتا کتے۔ وہ میرا پہلے والا سیٹھ تو اور تین لاریاں خرید لیا کتے۔

بشیر علی نے صابن بھرا اُستراو میں دری پر ڈال دیا اور اپنے میں اپنا منہ دیکھنے لگا۔

ہو..... سب لاریوں کے مالک، فیکٹریوں کے مالک، کھیتوں کے مالک۔ سب مالکوں کے بیج بھوت اچھے ہوتے ” “ہیں۔ ان کی پیک (فصل) خوب لہلہاتی ہے۔ ایک کا سر کاٹو تو دوسرا سر اٹھاتا ہے۔ انہیں تو جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دینا ہے۔



بشیر بھائی۔ خدا کی قسم۔ اب آپ بولے سوکروں گا۔ آپ میرے کو بتاؤ نا میں کیا کروں .....“ سلیم سچ مچ آستیں ”  
چڑھا کر بیٹھ گیا۔

ارے جاؤ بیٹا تم کیا کریں گے۔ سیدھے راستے پر چل کر ہم بھی دیکھ لے۔ تو بیچ کی دیواریں توڑنا پڑیں گی۔ لوگوں ”  
کے آگے ہاتھ پھیلاؤ تو بھیک ڈال دیتے ہیں۔ بس بھکاری بنے کھڑے رہو۔ ہمارے اوپر کب کسی کو رحم آئے گا۔ کب خیرات ملے گی۔“ بشیر علی اب بہت غصہ میں اچکا تھا۔ اور جب اسے غصہ آتا تو اپنے اس پاس کی چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹکنے لگتا تھا۔ اب اس کے آئینے کی شامت آچکی تھی۔

رات کو دیکھنے تم ہمارے دوستوں کی حالت۔ ہم حکومت کاساتھ دینا کتے۔“

میں بولتا وں حکومت ہم کو کیادی..... کیا ملا تمہارے کو.....؟ دس برس ہو گئے ، ملک کی آزادی کو ابھی نیک تم ”  
“رکشا پھینچ رہے ہو۔

ہمارے گاں کا جو ملیشمن ریڈی ہے نا۔ وہ اکیلا سوا یکر زمین کا مالک ہے۔“ سلیم نے اپنی دانست میں ملیشمن کے سب ”  
سے زیادہ دولت مند ہونے کا ثبوت دیا۔

یہی تو تمہاری غلطی ہے..... بشیر علی نے غصہ بھری نظروں سے سلیم کو گھورا

وہ اکیلا نہیں ہے۔ کوئی سیٹھ اکیلا نہیں ہوتا۔ اکیلا تو وہ ہرن ہوتا ہے جسے سب بھیڑیے گھیر کے مار ڈالتے ہیں۔ اور ”  
“پھر اپنے شکار کو کھاتے وقت وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔

آپ بھی بھوت ساہوکاروں کو مارے کتے نا بھائی۔“ جانے کیسے سلیم کے منہ سے نکل گیا۔ اور پھر وہ ڈر کے مارے  
!“کانپنے لگا۔ اب آگئی شامات۔ یہ تو قاتل ہے چاہے تو ایک منٹ میں سلیم کا گلا گھونٹ کر ختم کر دے۔ کون پوچھنے آئے گا۔

اچھا.....! تیرے کو کون بولا.....؟ بشیر علی نے اسے غور سے دیکھا تو وہ

اور گھبرا گیا۔

میں .....میں سنا تھا بھائی..... لوگاں جھوٹ بولتے نا۔ بس چپ اڑا دیئے کہ آپ کریم نگر کے بیڑی والے ”  
بابو خاں کو..... اور..... اور وہ ایک پولیس انسپکٹر کو کتے..... جانے دو بھائی لوگاں جھوٹ بولتے .....“ سلیم نے اس کی طرف دیکھ کرانی بات ادھوری چھوڑ دی۔

نیں وہ بات جھوٹ نہیں ہے۔ میں سچی بھوت لوگوں کو مارا وہ لوگاں ہمارے گنے کی فصل اٹھا کر لے گئے تھے۔ ”  
میرے بھائی کو ہمارے گھر کے سامنے جھاڑ سے باندھ کے اٹا مارے کہ وہ مر گیا۔ میرے بھائی کا کیا قصور تھا کہ انے پاشو نواب کی لڑکی کو پکڑ کے جنگل میں لے گیا تھا۔ پاشونو اب ہماری بہن کو موٹر میں بٹھا کر شہر لے گئے تھے۔ بول کے ہم ان کی بیٹی کو پکڑ کے لئے آئے۔ جب میرے بھائی کو جھاڑ سے باندھ کے مار رہے تھے تو کوئی پولیس والا نہیں آیا۔ پھر جب وہ مر گیا تو ہمارا بیان لینے کو آئے۔ میں نے جاکر و قار آباد کی پولیس کچہری میں عرضی لکھوائی۔ حیدر آباد کے وکیلوں سے ملا۔ وہ سالہ پولیس والا کیا بولا معلوم؟ اب وقت گزر گیا دیر ہو گئی۔ بس میرے کو خوب غصہ آیا۔ میں نے اس کی بندوق ہاتھ...چھین کر پہلے اس انسپکٹر کو مارا۔ پھر حیدرآباد کے اس جاگیردار کو جو ہمارے خلاف عدالت میں گواہی دیا تھا۔ اس کے بعد ...

باپ رے..... اے آدمیوں کو مار ڈالے آپ “..... سلیم خوف سے تھر

تھر کانپنے لگا۔

اصل میں آپ کا دماغ پھر گیا تھا۔ میرا باوا بھی ایک دن اسی طرح پاگل ہو گیا تھا تو اپنے ہی ساہوکار کو درانتی سے ”  
“مارڈالا تھا اُس نے۔

پاگل ہی ہو جاتے ہیں۔ “بشیرِ علی نے دیوار پر نظریں جما کے آہستہ آہستہ کہا۔”

کسی ایک لمحے میں انسان اپنی زندگی بھر کا صبر کھو دیتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے اپنے سارے بندھنوں سے اوپر ہو جاتا ہے۔ جیسے تیرا باوا تھا۔ اگر ٹھنڈے وقت میں کوئی اس سے کہتا کہ وینکٹی کو قتل کر دے تو کیا وہ بات مان لینا! پانچ..... پیڑھیوں سے وینکٹی کی جوتیاں کھانے والا۔ اس کے پسینے پر اپنا خون نچھاور کرنے والا۔ ایک پل میں اس پر وار کر بیٹھا... ، ، ...

پھر وہ دونوں چپ ہو گئے۔ سلیم گردن جھکائے بشیرِ علی کی میلی دری پر ایک فلم دیکھنے لگا۔ جب خون میں ڈوبا ہاتھ میں درانتی تھامے ہوئے باوا آنگن میں کھڑا ہانپ رہا تھا۔ ان کے آنگن میں وینکٹی کے خون کے دھبے پھیل گئے تھے۔

تیرے باوا کے ہاتھ میں درانتی کس نے دی..... تو کبھی سوچتا ہے؟.....؟ تو نے کبھی سیب کھایا۔ تیرے باوا نے ” نہیں کھایا۔ تیرے دادا نے نہیں کھایا۔ کیوں بولے تو ان کی قسمت میں نہیں تھا سیب کھانا، مٹھائی کھانا۔ دودھ پینا..... بشیرِ علی کو پھر غصہ آگیا۔ اس بار اس نے آئینہ پر اتنی زور سے مکا مارا کہ وہ ٹوٹ گیا۔

کھیت بھی چھین لئے ، بیل بھی چھین لئے۔ محنت کرنے والے ہاتھ بھی رہن رکھ لئے

اور تو شہر کی سڑکوں پر رکشا چلائے جا..... تیری یہی سزا ہے..... وہ پیر پٹکتا ہوا اچانک اٹھا تو سلیم ڈر کے مارے چونک پڑا..... کہیں وہ غصہ سے اسی کو نہ مار بیٹھے۔ مگر وہ

جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگا تو سلیم بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اچھا میں چلتاؤں بشیرِ بھائی..... سلام علیکم.....“ وہ جلدی سے باہر آیا”

اور رکشا کے پیڈل پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

منی کی دو پہر میں معظم جابی مارکٹ کی انگارے کی طرح دہکتی ہوئی سڑک پر وہ رکشا تھامے ننگے پاؤں کھڑا تھا۔ سامنے دکانوں میں کتنے پھل بھرے ہوئے تھے۔ سنترے، انگور، خربوز، تربوز..... اتنے بہت سے پھل کون خریدتا ہوگا..... کون کھاتا ہوگا..... ایک سنترہ اٹھ آنے سے کم نہیں ملتا۔ اب بھی بشیرِ علی کے گھر نیں آؤں گا۔ بڑا خطر ناک آدمی ہے وہ۔ ہر ایک کو جان سے مار ڈالوں گا بولتا۔ ہر ایک چیز کو توڑ کے پھینک دیتا ہے۔ میرے کو بولتا کہ میں بھی اس کے..... ساتھ آؤں..... میری شامت آئی ہے کیا..... اب کیا کروں.....؟ کدھر جاؤں

اچانک کوٹھی کی طرف سے لوگوں کا ایک ہجوم آگے بڑھنے لگا۔ کوئی جلوس آ رہا تھا شاید..... سلیم اکثر دیکھتا تھا کہ شہر میں جلوس بہت نکلتے ہیں۔ بھی اسکول کے بچوں کا جلوس فیسس کم کرو..... کبھی مزدوروں کا جلوس کہ ہمارے ساتھ انصاف کرو۔ مگر آج کے جلوس میں تو سب مرد تھے۔ ہاتھوں میں اونچے اونچے جھنڈے تھامے، ان جھنڈوں پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ سب زور زور سے چلا رہے تھے۔ ایک قطار بنا کے آگے بڑھ رہے تھے۔ جلوس کو راستہ دینے کے لئے رکشا، آٹو کاریں ، سب ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔

بینک میں کام کرنے والوں کا جلوس ہے۔ سرکاران کی تنخواہیں نہیں بڑھا رہی ہے کوئی موٹر سائیکل والا اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی سے کہہ رہا تھا۔

بینک میں کام کرنے والوں کا بھی پیٹ نہیں بھرتا۔ یہ لوگ اتنی تیز دھوپ میں سڑکوں پر چلاتے پھر رہے ہیں۔ سلیم بڑی تعجب سے ان صاب لوگوں کو دیکھنے لگا، جنہوں نے لکھنے پڑھنے میں اپنی آدھی عمریں گنوا دی تھیں۔ اب ان کی آنکھوں پر عینک لگی تھی۔ سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ دبلے پتلے سلیم نے اپنی رکشا ان کے پیچھے پیچھے چلانا شروع کی۔ شاید ان میں سے کوئی تھک کر رکشا میں بیٹھ جائے۔ مگر ان کی جیسوں میں پیسے ہوتے تو ہو چھوٹے بچوں کی طرح ہاتھوں میں جھنڈے اٹھائے اتنی تیز دھوپ میں کیوں سڑکوں پر گھومتے۔ کیا اب سایہ کہیں نہیں ملے گا.....؟ آگ برساتے ہوئے آسمان کو دیکھ کر سلیم سوچنے لگا۔ رکشا کہاں کھڑی کر کے سستاؤں؟

ایک اونچی بلڈنگ کے سائے میں رکشا روک کر وہ اندر بیٹھ گیا اور لنگی کے کنارے سے پسینہ پونچھنے لگا۔ آج صبح سے بھوکا ہوں۔ صبح سویرے بشیر علی سے ملنے چلا گیا۔ آج ایک بھی کرایہ نہیں ہوا..... آس پاس کوئی چائے خانہ بھی نہیں اب اتنی دھوپ میں کہاں کھانا ڈھونڈو..... چلو سو جاؤ شام کو دیکھیں گے۔

رکشا..... زمر دمحل چلتے؟

سلیم نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ برقعہ اوڑھے ایک عورت کھڑی تھی۔ منہ پر نقاب پڑی ہوئی تھی..... یہ لو.....  
...شام ہوگئی۔ فرسٹ شو کا ٹائم آ گیا۔

ہو..... تین روپے ہوں گئے۔“ اس نے کاملی سے کروٹ بدلی۔ شہر میں رہ کر اسے سواریوں سے نیٹنا آگیا تھا۔ ”  
خصوصاً عورتیں بدی کا نیاں ہوتی ہیں ان سے اگر ڈیڑھ روپیہ کرایہ لینا ہو تو تین روپے کہنا پڑتا ہے۔

اچھا، چلو.....“ وہ جلدی سے رکشا میں بیٹھ گئی۔ اس نے کوئی تیز خوشبو لگائی تھی۔ نقاب ابھی تک اس کے منہ پر ”  
تھی۔ برقعہ کے نیچے سے سرخ ساری کا چہکتا ہوا پلو نظر آ رہا تھا..... میل سے بھرے پاؤں تھے۔ اسی لئے سلیم نے اسے غور سے بھی نہیں دیکھا۔ ورنہ کوئی اچھی صورت شکل کی عورت اس کی رکشا میں بیٹھنے آتی تھی وہ اس کی صورت گھورے جاتا تھا۔

تم دھندا کرتے کیا.....؟ عورت نے آہستہ سے پوچھا۔

دھندا.....؟ کیسا دھندا..... بس رکشا چلانے کا دھندا کرتا ہوں اس نے زور

زور سے پیٹل پر پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

کوئی اور دھندا نہیں کرتے؟“ عورت نے پوچھا۔

کاں ملتا ہی بی دھندا..... میں گاؤں والا ہوں۔ میرے کو اور کوئی کام نہیں آتا

میرا دھندا کرو..... میں کسی کونے میں کھڑی ہو جاؤں گی۔ تم گا ہک لاؤ تگڑی آسامی لائے تو پانچ روپے دوں ”  
“گی۔

کیا.....؟ کیا بولے آپ..... سلیم نے ایک دم رکشا روک لی۔

‘ ‘ چلو نیچے اتر و..... تیری ماں کی..... سالی..... میرے کو بھاڑ کھانے والا سمجھی کیا؟“

عورت ڈر گئی۔ اور جلدی سے اترنے کے لئے اس نے نقاب الٹی تو سلیم چونک پڑا..... وہ مالن بی تھی۔

سلیم؟ تو.....؟“ وہ ڈر کے مارے کا پینے لگی۔

دونوں ہاتھ کمر پر رکھے۔ دیدے نکالے سلیم بے حد غصہ میں اسے گھورے جارہا تھا۔ یوں جیسے مالن بی گلا گھونٹ  
.....کر بھی ختم کر دے گا..... ہنوں میں اس کو مار ڈالوں گا

بشیر علی اتے آدمیوں کو مار ڈالا تو اسے کون پکڑا..... سالی رنڈی بن گئی اسے ”

‘ ‘..... تو مار ڈالنا ہی اچھا ہے

ایسا کیوں گھور رہا ہے میرے کو.....؟ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جالگی۔ اور پھر اسے بھی ایک دم غصہ آگیا۔

بڑا بہادر ہے تو..... چھوٹے صاب کو مارتاں بول کے بھاگ گیا گرج سے۔ وہ گاؤں والا ..... حرام زادہ میرے ” ساتھ رسم کر کے شہر کو چلا گیا۔ باوا بھی مر گیا..... گاؤں میں کوئی میرے کو نین بلایا۔ اس گرج میں کتے ڈلیور تھے، کلینر تھے..... تیرے کو

‘ ‘ یاد ہے نا ؟

‘ ‘ اب اس بڈھی کو میں دس روپے لا کرنیں دی تو موم بتی سے پیٹھ پر چر کے دیتی ہے ”

وہ نقاب میں منہ چھپا کے رونے لگی۔

اب سلیم سالن بی کو گھورنے کی بجائے زمین کو گھور رہا تھا۔

اس کے چاروں طرف بڑا شور مچا ہوا تھا۔ دنیا میں کسی کو فرصت نہ تھی کہ وہ مالن بی کی

بات کا جواب دے..... لوگ کاروں، اسکوٹروں، سائیکلوں پر بھاگ رہے تھے۔ سب ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں تھے۔ بڑی بڑی خوبصورت جگمگاتی ہوئی دکانوں میں سونے چاندی کے زیور، قیمتی ساریاں رکھی ہوئی تھیں۔ سلیم کے بالکل سامنے ایک دکان کے اندر شیشے کی دیوار کے پیچھے ایک بہت بڑی گڑیا کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے بنارسی تھامے۔ وہ راہ گیروں کو اندر آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ شہر میں جدھر دیکھو شیشوں کی دیواروں کے اندر لوگوں نے

.....رنڈیوں کی دوکانیں سجا رکھی ہیں۔ کسی کا مالن..... بشیر علی ٹھیک کہتا ہے۔ ایک پتھر اٹھا کر سارے شیشے توڑ ڈالو ...

رکشا..... شاہ علی بنڈہ چلتے..... “دونو جوان رکشا میں آبیٹھے۔ صورت سے کسی دفتر میں کام کرنے والے صاب ” لگتے تھے۔

.....آج تھری ایس ، ایس ایس ، میں بڑی رونق ہے۔“ سیاہ پینٹ والے نے سگریٹ سلگا کے کہا”

.....کیوں .....؟ کیا ہے وہاں .....؟“ اس کے دوست نے پوچھا

ارے آج تو ہندوستان کے سماجی حالات پر سیمینار تھا نا۔ سارے ہندوستان کے دانشور آئے ہوئے ہیں۔ اب وہ اپنے ” دھواں دھار پیپر ختم کر کے ڈنر سے پہلے بیئر پی رہے ہوں گے وہاں .....با ہا ہا“ اس کا دوست ہنسنے لگا۔

یار یہ دانشوروں کا اور کوئی مصرف ہی نہیں رہا ہے کیا..... ہر طرف سیمینار کرتے پھرتے ہیں..... عوام ” کے لئے۔“ کالے پینٹ والے نے بڑے طنز کے ساتھ کہا.....”عوام..... یہ آج کے تمام لیڈروں کا دانشوروں کا ، ادیبوں اور شاعروں کا محبوب موضوع ہے ”عوام“ سٹے کا پانسہ ہے۔“ الیکشن جیتنے کا ٹکٹ ہے، مشاعرے کو لوٹنے والی غزل ہے۔ سال کا سب سے بڑا ایوارڈ جیتنے والا افسانہ ہے۔ عوام کی سیڑھی تھام کر تم چاہے کتنی ہی بلندی پر پہنچ جاؤ عوام بھی دھوکا نہیں دیتے ہیں۔

.....سلیم چپ چاپ رکشا کھینچتا رہا

بس روک لو“.....وہ دونوں اتر گئے تو سلیم نے سوچا۔ ”

.....یہ سالے بھی بشیر علی کے ساتھی معلوم ہوتے ہیں

صبح اسے رام سوامی کلینر نے جگایا۔ رام سوامی نے بی اسے اپنی ضمانت پر رکشا دلوائی تھی۔ وہ خود بھی ابھی تک بابو میاں کی لاری کلینر تھا۔ مگر کبھی کبھار سلیم کے پاس آبیٹھتا۔ پرانے شہر میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے شہر میں جینے کے ڈھنگ اسے آتے تھے سیندھی بپنے اور محبوب کی مہندی کا پروگرام اسی کے ساتھ بنتا تھا۔ مگر آج صبح رام سوامی ایک بری خبر لایا تھا۔ رکشا کا مالک رکشا بیچ رہا ہے۔ اس لئے سلیم کو رکشا واپس کرنا ہوگی۔ اب کیا ہوگا۔

اب کیا ہوگا.....؟؟”

میرا ایک دوست خاسم ہے۔ وہ مستری کا کام کرتا ہے تو اس کے ہاتھ کے نیچے مزدوری کرنا۔ روز پانچ روپے مل ” جایا کریں گے...“ رام سوامی نے اسے پریشان دیکھ کر تسلی دی۔

مگر رکشا واپس کر کے کئی دن گزر گئے۔ رام سوامی نے کئی جگہ کوشش کی ہر جگہ مزدور زیادہ تھے۔ کام کم تھا۔ سلیم اپنے کپڑے ایک تھیلی میں ڈالے، دھوپ میں مارا مارا پھرتا۔ رکشا اس کا گھر بھی تھا اور کمرہ بھی۔ بستر کی ضرورت تھی نہ سامان رکھنے کے لئے کمرہ کی۔ اب کسی دوکان کے پڑے پر سونے لیٹتا تو کئی بار پولیس والا یا کوئی چوکیدار اٹھا دیتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر کسی فٹ پاتھ پر سو جاتا۔ کئی بار سو چارتا کے گھر جائے۔ شاید وہ کوئی کام دلوا دے۔ مگر ملیش سے ڈر لگتا تھا۔ بشیر علی کے غصہ سے بھی وہ ڈرتا تھا۔ خطرناک آدمی ہے کسی دن اس کے ساتھ دیکھ کر پولیس والے پکڑ لیں گے۔ نرسی اپنی پارٹی کے کاموں پر لگا رہتا تھا۔ کئی بار سلیم اس سے ملنے کمیونسٹ پارٹی کے دفتر گیا۔ مگر نرسیا کو فرصت ہی نہ تھا کہ اس سے بات کرتا۔ پھر ایک دن نرسی نے بتایا، بشیر علی بنگال چلا گیا۔

تجھے رکشا چلانے کا کام مل گیا ہے...“ ایک دن رام سوامی نے خوشخبری سنائی۔

”مگر رکشا صرف رات کو چلانا پڑے گی۔ پھر بھی تجھے پانچ روپے روز مل جایا کریں گے۔“

شام کو رام سوامی اسے اپنے ساتھ لے کر گیا۔ رکشا رات کو صرف دو گھنٹے چلا نا تھی۔

آدھی رات کو رکشا میں گڑمبہ (دیسی شراب) کے گھڑے رکھ کر دکانوں پر پہنچانا تھے۔ رکشا پر پردہ ڈال دو تو پولیس والوں کی نظر نہیں پڑتی۔ لوگ سمجھتے ہیں سکند شہود یکھ کر عورتیں جارہی ہیں۔

بھوک اور بیروزگاری سے تنگ ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ کام اسے کچھ مشکل نہ لگا۔ یوں بھی شہر میں ایمان داری کا کام کہاں ہے۔ رات کو جب وہ شراب کی بھٹی پر گیا تو اس کا مالک لنگیا اسے ایک کونے میں لے جا کر اونچ نیچ سمجھانے لگا۔

پرانے پل سے بڑی سڑک پر مت جانا۔ نیچے کی گلیوں میں سے رکشا لے جاتا۔ پولیس ہمارے پیچھے لگی رہتی ہے۔ ”  
بھوت ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا۔ رکشا کے اوپر پردہ لگا رہے گا۔ کوئی پوچھے تو کہنا زنانی سواریاں ہیں۔ جلدی جانا ہے۔ پھر  
بھی اگر پولیس والا پکڑ لے تو گھبرا نکو۔ میں تیرے کو چھڑالوں گا..... سمجھ گیا نا.....؟“

سلیم کچھ نہیں سمجھا۔ وہ تم صرف ایک بات سمجھ رہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد اس کام کا معاوضہ پانچ روپے ملے گا۔  
پھر دن بھر مزے کرو۔ لنگیا سے کہوں گا رات کو بھی یہیں سونے دے۔ ایک روپے کا روز کھانا کھاؤ۔ ایک روپیہ بیڑی کاڑی  
کے لئے رکھو۔ تین روپے روز بچیں گے۔ اس مہینے چھپیں ۲۵ روپے بھائی کو بھیج دوں گا۔

پولیس والے کی سیٹی پر وہ چونک پڑا۔ اچانک آدھی رات کو وہ اُجاڑ صورت کھٹمل جانے کدھر نکل آیا۔ لنگیا نے کہا  
تھا۔ بڑی سڑک سے مت جاتا۔ وہ پانچ روپے کے سہانے خوابوں میں یہ بات بھول ہی گیا۔

.....رکشا روکو

”رکشانکور وکو صاب۔ زنانی سواری ہے۔ ارجنٹ کام ہے میرے کو۔“

چپ سالے آدھی رات کو انگلش بولتا ہے۔ پولیس والے کے ایک ہی مکے سے تارے

نظر آ گئے۔ پھر والیس والے نے اپنے ڈنڈے سے رکشا کا پر دہ پھاڑ دیا اور تارچ کی روشنی اندر پھیکی..... اتنی دیر میں دو  
موٹر سائیکل سوار پولیس والے اور آگئے..... بس پھر کیا

تھا.....اللہ دے اور بندہ لئے حوالات میں اتنی مار پڑی کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ تین دن

بعد ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال کر پولیس کی موٹر میں بٹھا کر اسے عدالت کو لے جا رہے تھے تو راستے میں رتنکا مکان پڑا.....  
بنگلے پوپولیس کا پہرہ تھا۔ تب اسے یاد آیا..... نرسی نے بتایا تھا کہ ملیشہ اب منسٹر ہو گیا ہے۔

عدالت میں لنگیا بھی آگیا تھا۔ اس نے اشارے سے سمجھایا کہ میں معاملہ سنبھال لوں گا۔ مگر اتنی مار پڑنے کے بعد  
اب جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ سواس نے ہر بات سچ سچ

بتادی.....

.....پھر حج نے سزا کا فیصلہ سنایا..... چھ مہینے کی جیل

جیل.....؟ سلیم نے دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ لیا اور پھر وہیں زمین پر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگا۔ چھ  
مہینے کی جیل..... میری اماں..... اماں سنے گی تو مرجائے گی..... کیسے کٹیں گے چھ مہینے.....؟

.....لنگیا نے اسے بڑی محبت سے اٹھایا۔ رام سوامی بھی آگیا

تو اتنا کیوں گھبرا رہا ہے۔ میں تجھے چھڑالوں گا۔

.....اے جا سالے۔ تیرے ماں کی.....“ اس نے غصہ میں لنگیا کے ہاتھ جھٹک دیئے

‘ ‘.....مجھے جیل بھجوا دئیے۔ اب چھڑاتے کتے

جیل میں پہلا دن قیامت تھا۔

حوالات کی مارنے جوڑ جوڑ دکھا دیا تھا۔ طبیعت تو پہلے ہی خراب رہتی تھی تکلیف اور

خوف کے مارے اسے خوب تیز بخار چڑھا۔

کچھ یاد نہیں کہ کھانا بانٹنے والے آدمی نے اسے کتنی بار پکارا۔ اس کو ٹھہری کے دوسرے قیدیوں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہا۔ مگر وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر دو آدمی ایک اسٹریچر لے کر آئے۔ سلیم کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا اور لے کر چلے۔

اب کہاں لے جا رہے ہو مجھے..... آنکھیں کھول کر وہ پھر چلانے لگا۔ مگر ”

کسی نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ ایک میز پر اسے لٹا کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر گلے میں آلہ ڈالے آیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اب پھر اسے اسٹریچر پر ڈال کر لے چلے۔ مگر جیل کی کوٹھری کی بجائے ایک ایمبولنس کار میں بٹھا کر کہیں لے جا رہے تھے۔

لو عثمانیہ ہاسپٹل آگیا.....“ کتنی بار اپنی رکشا میں وہ یہاں سواریاں لے کر آتا تھا۔ وہاں پھر ڈاکٹر اس کا جان کو ” جیونٹیوں کی طرح چمٹ گئے۔ اس سے پہلے وہ کئی بار اپنے بخار کھانسی کا علاج کرانے آیا تھا۔ گھنٹوں قطار میں کھڑا ہونے کے بعد ایک لال دو شیشی میں بھر کے دیتے تھے ، اور آج وہ جیل سے آیا تھا تو ہسپتال کے سب بڑے ڈاکٹر اس کے آس پاس کھڑے تھے۔

پھر اسے ایک نرم صاف ستھرے بستر پر لٹا دیا گیا..... بستر کے آس پاس دن رات پولیس والے کھڑے تھے۔ جیسے وہ بھی ملیشمن کی طرح منسٹر بن گیا ہو۔

صبح ہوئی تو سر ہانے والی میز پر دودھ ، ڈبل روٹی اور ایک موسمی رکھی تھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھوئے بغیر دودھ کا گلاس منہ سے لگالیا۔

کہیں بخار اُتر نہ جائے..... وہ ہر وقت دعائیں مانگتا۔ صبح ڈاکٹر اسے دیکھنے آتا تو خوب ڈھونگ کرتا۔

ہائے ہائے ، درد سے چھاتی پیٹتی جا رہی ہے۔ رات کو بھوت بخار آیا تھا ڈاکٹر صاب..... ڈاکٹر صاب آج میں ’ ’ ‘ ‘ .....مر جاؤں گا کیا

نہیں تم اچھے ہو جائیں گے..... تمہارے کوئی ، بی ہے۔ اس کے واسطے ”

‘ ‘ .....چھاتی میں درد بھرا..... ہم اچھے انجکشن دیں گے

ٹی، بی..... لو اب تو ٹھاٹھ کرو بیٹا۔ ابھی بھوت دن لگیں گے علاج میں۔

کھانے میں دودھ ڈبل روٹی۔ لیٹنے کو صاف ستھرا نرم نرم بستر ، اور درد کم کرنے کے لئے دوا نیں۔ زندگی مزے میں گذر رہی تھی۔ کیسی بولی ( بے وقوف ) سرکار ہے جی۔ ایمان داری سے محنت کرو تو گھر ملتا نہ کھانا۔ اور بے ایمانی کرو تو دودھ ڈبل روٹی کھلاتے۔ بچھونے پر سلاتے۔

ایک دن اس نے وارڈ میں جھاڑو دینے والے مہتر سے یہی بات کہی تو وہ بڈھا اپنی ٹوٹی کمر سیدھی کر کے بولا۔

ہو ، چوروں، مجرموں کو کھانا پانی، دوا دینے کی ذمہ داری ہے نا سرکار پر، اس لئے ”

”دیتے ہیں۔

تو نیک اچھے لوگوں کو کھانا پانی دینے کی ذمہ داری کس کی ہے .....؟ اس نے کتنی بار یہ بات بوڑھے مہتر سے پوچھی۔ مگر وہ سر جھکائے ٹی۔ بی کے مریضوں کے خون بھرے اگالداں اٹھا تا رہا۔

پھر ایک دن دیکھ تو وہ اجاڑ صورت لنگیا۔ رام سوامی کے ساتھ اپنی منحوس صورت لئے آگیا۔ ساتھ میں دوسر کاری ‘ ‘ .....آدمی تھے۔ ” یہاں انگوٹھا لگا و

اب جاؤ تمہیں چھوڑ دیئے.....“ نگیا کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔“

کیوں.....؟ کیوں چھوڑ دیئے.....؟ سلیم نے گھبرا کے پوچھا۔ یوں“

جیسے اب اسے عمر قید کی سزا کا کوئی حکم سنا رہا ہو۔

‘ ‘ .....تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے بول کے سر کار معاف کر دی“

ایسی کی تیسری سرکار کی۔ سلیم نے دل ہی دل میں سرکار کو گالی دی۔

لنگیا نا! میں پھر تمہارا کام کروں گا۔ روز گڑمبہ لے کر جاؤں گا۔ اس نے لنگیا کی بہت

خوشامد کی۔

جا بے جا.....میں تیرے جیسے بولے (بے وقوف) چھوڑوں کو کام نہیں دیتا۔ تیرے لئے پولیس والوں کو سورو“  
بے کھلانا پڑے تو جیل سے چھڑاے۔“ اب وہ لنگیا سے کیا کہتا کہ یہی تو اس نے سب سے بڑی غلطی کی۔ اس کی بیماری اور  
جیل جانے کی خبر نہ سیانے بھی سنی اور وہ اسے ڈھونڈتا ہوا کشاؤں کے اڈے پر آیا۔ سلیم نے اپنی پوری کہانی اسے رورو کر  
سنائی۔

‘ ‘ .....تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب رکشا نکو چلا

‘ ‘ .....پھر کیا کروں

اس سوال کا جواب نرسیا کے پاس بھی نہیں تھا۔

میں کوشش کروں گا تیر کوکسی فیکٹری میں مزدوری مل جائے۔ میں سگریٹ فیکٹریوں کی مزدور یونین کاسکر یٹری“  
‘ ‘ .....ہوں نا

اور بشیر بھائی حیدرآباد سے کیوں چلے گئے.....؟ اس نے نرسی سے پوچھا۔ وہ

‘ ‘ .....ہماری پارٹی والوں سے اس کی لڑائی ہوگئی

اچھا.....؟ پارٹی والے بھی لڑتے ہیں.....؟ سلیم کو بڑا تعجب ہوا۔“

‘ ‘ وہ بنگال میں کچھ لوگ پھر گوریلا لڑائی شروع کرے ہیں نا“

تو کی بشیر علی ان کے ساتھ لڑنے کو چلا گیا؟“ سلیم نے پوچھا۔“

کیا معلوم.....“ نرسی نے سگریٹ سلگا کے ایک کش لیا اور پھر وہی سگریٹ سلیم کے ہاتھ میں تھمادی۔“

کوئی بولا کتے۔ وہ پھر عادل آباد آ گیا ہے۔ ایک ساہوکار کے بیٹے کو مار ڈالا کتے..... اب اس کے خلاف وارنٹ“  
“نکلے ہیں۔ اخبار میں خبر آئی تھی۔

“سچی.....؟“ سلیم بڑا دکھ ہوا۔ آخر بشیر علی کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے۔“

نرسی اب میں کیا کروں۔ تو مجھے بتانا۔ تو بھی آج گیا تو سال بھر کے بعد آئے گا میرے سے ملنے.....“ سلیم اب“  
سیچ مچ رونے لگا۔



نرسی گردن جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا ..... یہ بات آج اپنی پارٹی کے لوگوں سے بھی پوچھوں گا..... ” “  
‘ ‘ سلیم کے لئے کیا کرنا؟

تو نکو گھبرا..... میں اتوار کے دن پھر آؤں گا۔ یہ لے پانچ روپے۔ روز دواخانے جا کر دوا ضرور لانا..... ”  
.....”اچھا“..... نرسی نے اس کا ہاتھ پکڑا جو بخار سے گرم ہو رہا تھا۔ اور پھر چھوڑ دیا

کتنی اتوار میں گذر گئیں۔ نرسیا نہیں آیا۔ اب وہ ہوٹل کی جھوٹی پتر ولیاں چاٹ کر دن  
گزار رہا تھا۔

نئے پل کی ریلنگ پر بیٹھا وہ گذرنے والوں کو گھورے جاتا تھا۔

یہ سب کہاں جارہے ہیں..... کس اُمید میں دوڑ رہے ہیں۔ کوئی مجھے ساتھ کیوں نہیں لیتا۔ کب تک یہاں بیٹھا  
انتظار کئے جاؤں۔

ایک دن وہ فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ گھٹنوں میں سر دہائے۔ اس کے اوپر کوئی چیز گری..... دس پیسے  
.....لو..... کسی گزرنے والے نے اسے بھکاری سمجھ کر ترس کھایا..... کون تھا وہ.....؟ کدھر گیا.....؟

شہر والے بھیک دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ سڑک سے گزرنے والا ہر آدمی ، ہاتھ

پھیلانے والے بھکاری کو کچھ نہ کچھ دے کر اپنی جان چھڑا لیتا ہے، ورنہ شاید انہیں رات کو نیند نہ آئے۔ خواب میں وہ بھکاری  
.....بھوت بن کر ان کا پیچھا کر۔ گلا گھونٹ دے

بڑی دیر تک دس پیسے کا سکہ وہیں پڑا رہا۔ راہ گیروں کے پیروں سے اڑنے والی دھول

میں چھپتا رہا۔ پھر اچانک وہ سورج بن گیا۔ ساری دنیا کو اجالے کے لئے اس کی روشنی سے سلیم کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس  
نے بڑی مشکل سے دونوں ہاتھوں سے اس وزنی سکے کو اٹھایا اور چنے بیچنے والے کے سامنے پٹک دیا۔ ” اس پیسے کے  
“چنے دو۔

جس وقت وہ فٹ پاتھ پر بیٹھا ایک ایک کر کے چنے چبارہا تھا تو اسے یوں لگا جیسے اندھیرے میں گذرنے والی ہر  
موٹر کی دو آنکھیں اس کے آر پار دیکھ رہی ہیں۔ بازار تمام روشنیاں دیدے بن گئی تھیں۔ اب اچھا یہی تھا کہ وہ سر جھکائے  
بیٹھا رہے..... شہر میں رات ہی نہیں آتی کہ اماں کا پلو مجھ چھپ جاؤ۔ شہر کی رات تو رنڈی کی طرح ننگی ہوتی ہے۔ کوئی  
.....بات، کوئی راز۔ ڈھانک کر ، چھپا کر نہیں رکھتی

دُنیا بھر کی آوارہ گردی کرنے کے بعد سلیم رکشاؤں کے اڈے پر آیا۔

شام ہو رہی تھی۔ اس لئے کوئی رکشا اڈے پر نہیں تھی۔ وہ اکیلا فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سڑک

پر دوڑنے والوں کا تماشہ دیکھنے لگا۔

ایک موٹر سائیکل اس کے پاس آکر رکی۔ ایک لڑکا اُترا۔ اٹھارہ انیس سال کا لڑکا۔ صورت سے کسی بڑے آدمی کا بیٹا لگتا تھا۔ کسی کالج میں پڑھنے والا کاندھے پر ایک جھولا پڑا تھا۔

تمہارا نام سلیم ہے.....“ لڑکے نے جیب سے اپنی ڈائری میں اس کا نام

اور حلیہ پڑھ کر پوچھا۔

جی..... جی ہاؤ.....“ سلیم تھر تھر کانپنے لگا۔ اب آئی کوئی اور آفت

تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ پیچھے بیٹھ جاؤ۔“..... اس نے اسکوٹر اسٹارٹ

کرتے ہوئے کہا۔

کہاں..... سلیم نے تعجب سے پوچھا۔

بشیر علی کو جانتے ہونا۔ ہم اسی کے آدمی ہیں..... اس نے آہستہ سے سلیم

کے کان میں کہا۔

بشیر علی؟..... اب سلیم اور گھبرا گیا..... وہ تو پھر ڈا کو بن گیا ہے۔

پولیس والوں کو مار ڈالنا کتے۔ اس کے خلاف تو وارنٹ ہے کتے۔ یہ لڑکا مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے اب..... جیل کے راستے پر جانا ہے

اسکوٹر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ شہر ختم ہو گیا۔ اب جنگل کا راستہ آیا..... اچانک

کسی جھاڑی سے ایک آدمی نکلا۔ وہ سائیکل پر آیا تھا۔ اسکوٹر والے لڑکے نے اُتر کے خود سائیکل تھام لی اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف مڑ گیا۔ اب سائیکل والے نے اسکوٹر اسارٹ کی۔ یہ کوئی ادھیر عمر کا موٹا سا آدمی تھا۔ پینٹ بش شرٹ پہنے ، صورت سے کسی دفتر کا صاب لگ رہا تھا۔ یہ لوگ مجھے کہاں لئے جارہے ہیں۔

جنگل ختم ہوا تو لق و دق میدان آ گیا۔ سڑک اوپر بی اوپر چڑھتی چلی جارہے تھی اب ایک جیسے بنے ہوئے مکانوں کی قطار شروع ہوئی۔ سمنٹ کی کچی چھتوں کو بے شمار لکڑیاں تھامے کھڑی تھیں۔ ان چھتوں پر چڑھنے کے لئے بانسوں سے باندھ کر مچان بنایا تھا۔ چھتوں پر بھی پانی ڈالا گیا تھا شاید۔ پیدل چلتے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے سلیم کی پیٹھ پر گر رہے تھے۔ ایک مچان پر پاؤں رکھ کر وہ اس آدمی کے ساتھ اوپر چڑھاؤ کچی بھیگی ہوئی چھت کے اوپر بشیر علی لیٹا ہوا تھا۔ بڑی بڑی کالی مونچھیں دھوتی اور کرتا پہنے۔ لمبا سا سفید بٹو لگائے۔

.....سلام علیکم بشیر

مگر بشیر علی نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا کہ اس کا نام نہ لو۔ پھر وہ تلگو میں بولا۔

تجھے کیا ہوا.....؟ اتناؤ بلا کیوں ہو گیا.....؟

وہ جیل کا ڈاکٹر بولا تھا۔ ٹی بی بے کتے میر کو ،..... سلیم نے چاروں طرف دیکھ کر لا پرواہی سے کہا۔ یہ ” کتنی اونچی جگہ تھی۔ پورا حیدر آباد جیسے بشیر علی کے پیروں تلے پھیلا ہوا تھا۔ نیچے اب ہر طرف روشنیاں جھللا رہی تھیں۔ مگر بشیر علی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور آسمان پر ایک ہوائی جہاز نیچے اتر رہا تھا۔ اس کی دُم پر لگی ہوئی سرخ بتی سلیم کی طرح پلکیں جھپکا رہی تھی۔

تجھے ٹی بی ہوگئی.....؟“ سلیم کو یوں لگا جیسے کوئی کڑوی چیز بشیر علی نے نگلی ہو۔

میں تیرے کو بہت دن سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے تجھ سے ایک کام ہے۔ تو کل رات

کو دس بجے کے بعد یاں آنا۔ وہ جو سامنے اینٹوں کا ڈھیر ہے۔ وہاں کاغذوں کا ایک بنڈل ہوگا۔ وہ کال میں ایک لڑکا کو دے دینا۔ ”تجھے روز پانچ روپے ملیں گے۔“

پانچ روپے روز سلیم نے دُکھتے ہوئے سینے کو تھام کر کہا۔

مگر تو بھوت ہولا ہے۔ اس سے پہلے میرا کام چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ بہت ہوشیاری

‘ ‘.....سے کام کرنا ہوگا۔ تجھے کوئی نہیں پہچا تھا۔ اس لئے تجھے بلایا ہے میں نے

تم ادھر ادھر کو پھر و بشیر بھائی۔ نرسی مجھے بولا کتے تمہارے کو پولیس والے پکڑنے والے ہیں۔ تم نرسی کے ” لوگوں سے بھی لڑتے کتے نا۔ پولیس والوں کو مارے بنگال جا کر لڑنا سیکھ کر آئے کتے۔“

اچھا.....“ بشیر علی بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

تجھے نرسی سب بتادیا؟ ہاؤ۔ میں ان کی پارٹی کی بات نہیں مانتا۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور جیب سے ایک بیڑی نکال کر ” سلگانی۔ ایک سلیم کو دی۔

وہ لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ الیکشن میں کھڑے ہوں گے۔ مگر الیکشن میں کیا ہمارے جیسے غریب لوگ کھڑے ” ہو سکتے ہیں؟.....! الیکشن جیتنے کی قیمت بے تین چار لاکھ روپے اور جیت گئے تو روپیہ دینے والوں کی بات ماننا پڑے گی۔ “اب اصل کو منافع کے ساتھ وصول کرتے ہیں وہ لوگ۔ اور اس کے لئے منسٹر بنا ضروری ہے۔

آپ کی باتاں میری سمجھ میں نہیں آتے بھائی.....“ سلیم نے اُکتا کے کہا۔ بشیر علی جب بولنے پر آتا ہے تو اس کی ” باتیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔

تو میری بات کبھی سمجھنا ہی نہیں چاہتا نا۔..... بشیر علی کو پھر غصہ آ گیا۔

نہیں بھائی۔ میں آپ کو یہ بات بولتاؤں کہ آپ کسی اچھی پارٹی کی طرف جانا تھا۔ یہ مارم پیٹی کب تک کرتے ”.....“ سلیم بھی اب بشیر علی کے رعب میں آنے والا نہیں ہے۔

کونسی پارٹی کے ساتھ؟..... بشیر علی نے دور زمین پر تھوک کر پوچھا۔

ہر پارٹی الیکشن میں ووٹ دینے کی آزادی دیتی ہے۔ زندہ رہنے کی آزادی کیوں نہیں دیتے.....؟“ کونسی اچھی ” پارٹی ہے تو بتا مجھے۔ تجھے نوکری دینے والی پارٹی؟ تیرے خاندان کو پچاس برس سے رہن رکھنے والی پارٹی.....؟ تیری بیماری کو علاج کرنے والی پارٹی، اچھی پارٹی کونسی ہے؟ تو مجھے بتا...! ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہے۔ ہم ”نہ گاؤں جاسکتے ہیں نہ شہر میں جی سکتے ہیں۔

وہ اپنے گاؤں کے صابر میاں تھے نامر شد صاب۔ جب ویٹنگٹی کو باوا مارا تھا تو بولے تھے تیرا باوا۔ دوزخ میں ” جائے گا۔ کسی کو جان سے مارنا گناہ ہے۔

سلیم چاہتا تھا بشیر علی کو دوزخ کے عذاب سے ڈراے۔ تا کہ دولوگوں کو قتل کرنا چھوڑ دے۔

اب تو گاؤں گیا تو مرشد صاب سے پوچھنا کیا تھوڑا کر کے مارنے والے سیدھے جنت میں جائیں گے.....؟ بشیر ” علی اب بے حد غصہ میں آچکا تھا۔

بھوکا رکھ کر، ننگا کر کے، عورتوں کی عزت لوٹ کر۔ غلام بنا کر رکھنے والوں کو اللہ میاں جنت میں جگہ دیتے ہیں کیا.....؟ پھر اس نے اپنا لہجہ بدل کر بڑی محبت سے سلیم کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا۔

”تو میری فکر نکوکر بھائی، اپنا علاج کر۔ ابھی سے کیوں مرنے کی تیاری کر رہا ہے۔“

مجھے آپ کی بھوت فکر لگی ہے بھائی.....“ اس نے بڑی محبت سے بشیر علی کا ہاتھ تھام لیا۔ یوں جیسے وہ بشیر علی نہیں مراد ہو۔

نرسی بولا۔ آپ کے وارنٹ نکل گئے ہیں۔ پولیس والے آپ کو ڈھونڈ رہیں کتے.....“ ”ہاں مجھے معلوم ہے۔“..... وہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے مگر تو کیوں فکر کرتا ہے؟ میں نہیں مروں گا..... ہزاروں لاکھوں لوگوں میں مل کر جیوں گا..... جب بھی کوئی بچہ ظلم سہنے سے انکار کرے گا، کسی ظالم پر وار کرے گا وہ بشیر علی ہوگا..... سمجھ گیا نا تو.....؟

سلیم کی سمجھ میں صرف ایک بات آئی کہ اپنا سارا غصہ اب وہ کالج کے لڑکوں کو بانٹ

..... رہا ہے..... اپنی بات اس نے ہر طرف پھیلا دی ہے۔ کچھ بھی کرے میری بلا..... سے

رات کو وہ روز کالونی تک بس سے جاتا تھا۔ ٹوٹی اینٹو کے ڈھیر تلے کاغذوں کے بنڈل میں لپٹا ہوا پانچ روپے کا نوٹ بھی مل جاتا۔ اور کیا چاہیے اپن کو.....؟

کئی مہینے گزر گئے۔ اس کے بعد یہاں کبھی بشیر علی نظر آیا نہ اس کا کوئی ساتھی یہ لوگ جانے کس وقت کا غز رکھ جاتے تھے۔

پھر ایک رات سلیم نے پوری اینٹو کا ڈھیر ڈھونڈ ڈالا۔ کہیں کوئی بنڈل نہیں تھا۔ کاغذوں

کا لفافہ وہاں پھٹا پڑا تھا..... اور پانچ روپے کا نوٹ بھی مل گیا۔ کاغذ کیا ہوئے.....؟ آس پاس دُور دُور تک کوئی آدمی نہیں تھا۔

اس دن کے بعد سلیم کئی دن واں گیا..... کاغذ وہاں نہیں تھے..... لو سلیم

میاں..... اب کیا کرو گے.....؟

وہ پھر رام سوامی کے پاس گیا کہ کوئی رکشا دلوا دے۔ کب تک بھوکا سو یا کروں! کئی مہینے گزر گئے۔

ایک دن سلیم رکشا میں پاؤں سکیٹر کے سوراہا تھا تو نرسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ ”تو نے سنا..... پرسوں  
”بشیر علی کو پھانسی دی جائے گی۔“

بشیر علی کو پھانسی۔“ دکھ کے مارے سلیم رو پڑا۔

اسے پولیس نے کب پکڑا.....؟“

بہت دن ہوئے۔ اس کے خلاف پولیس نے جال بچھایا تھا۔ وہ اپنی تحریک کو کالجوں اور آفسوں میں پھیلا رہا تھا۔ ”  
پولیس کو سارا سراغ مل گیا۔

.....اچھا..... تو وہ کاغذ..... مگر سلیم نے یہ بات نرسی سے نہیں کہی

”کل اس سے ملنے کا آخری دن ہے۔ میں بھی جا رہا ہوں۔“

”میں بھی چلوں گا۔“

بشیر علی سے ملنے بے شمار لوگ آئے تھے۔ جن پارٹی والوں سے اس کی لڑائی تھی وہ بھی اس سے ملنے آئے تھے۔  
کالج کے پروفیسر، اسٹوڈنٹس، رکشا چلانے والے اس بجوم میں سلیم کو مالن بی نظر آئی۔

مالن.....؟ تو یہاں.....؟

روتے روتے مالن کی آنکھیں سوجھ گئی تھیں۔

ہاں، وہ میرا منگیتر ہے۔ میں نے اس کے لئے تو گاؤں چھوڑا تھا۔“ مالن برقعہ کے دامن میں منہ چھپا کر رو رہی  
تھی۔

سلاخوں کے پیچھے، بشیر علی کھڑا تھا۔ وہ بہت ڈبلا ہو گیا تھا۔ مگر اس کی آزاد کی گرج اسی طرح باقی تھی۔ وہ سب  
سے باری باری ہاتھ ملا رہا تھا۔

تم لوگ رونا نہیں۔ میں نہیں مروں گا۔ مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکا دو۔ مگر میں بار بار ”

”پیدا ہوں گا۔ اسی طرح چلاتا رہوں گا۔“

پھر اس کی نظر سلیم پر گئی جو دور کھڑا اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔

سلیم.....؟ سلیم..... وہ ہاتھ اٹھا کر چلا رہا تھا۔“

سلیم تو گاؤں کو ضرور جانا۔ اپنے پاؤں اپنی دھرتی پر جمائے رکھنا۔ مجھے مار ڈالو۔ مگر میرے بیچ میرے کھیتوں  
، ‘ میں ضرور اگیں گے۔ ہر سال میری پیک (فصل) کوئی نہ کوئی ضرور کاٹے گا..... سلیم..... سلیم

ایک دن سلیم کسی ارادے کے بغیر رتاً کے گھر پہنچ گیا۔

پہلے گیٹ کے پھرہ دار سے پوچھا کہ صاب تونیں ہیں۔

”در اسانی ( بیگم صاب) کو بولو، ان کے گاؤں کا سلیم آیا ہے۔“

چپراسی بھاگتا ہوا اندر گیا اور رتنّا دوڑتی ہوئی باہر آئی۔

آ.....اندر آنا“.....پورچ میں سے گذر کے اس نے اپنے شاندار ڈرائینگ روم کے دروازے پر رُک کر کہا۔“

وہ آج تک کبھی رتنّا کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ مگر اب تو رتنّا نے اپنے دروازے سے سب کے لئے کھول دیئے ہیں.....“ سلیم گردن جھکائے کھڑا رہا۔

یہاں بیٹھو“..... رتنّا نے سرخ مخمل کے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔“

اس گھر میں میرے لئے کونسی جگہ ہے.....سلیم سوچ رہا تھا..... وہ صوفے پر بیٹھا تو اندر ہی اندر دھنسنے لگا۔ جیسے کوئی، اسے گہرے پاتال میں لئے جارہا ہو۔ باہر تو بے حد گرمی تھی۔ اس کمرے میں ہوا اتنی ٹھنڈی کیوں ہے۔ ان سالے ساہوکاروں نے ٹھنڈی ہواؤں کو بھی اپنے کمرے میں بند رکھا ہے۔ سلیم نے ادھر ادھر دیکھا..... سامنے لارڈ وینکٹیشو کا بڑا سا فوٹو لگا تھا۔ اس کے اوپر سنہرے پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ یہ فوٹو ملیشمن نے اپنے کمرے میں کیوں لگایا ہے؟ سلیم کو تعجب ہوا..... کہتے ہیں کہ لارڈ وینکٹیشو را تو سب کے دلوں کا حال جانتے ہیں۔ وہ بڑے جلالی دیوتا ہیں۔ اس کمرے میں ان کا کیا کام!

”تو اتنا د بلا کیو ہو گیا ہے.....؟ کیا بیماری ہے! گاؤں گیا تھا کیا.....؟ اس رات میں نے تیرے بہت راہ دیکھی۔“

تو اب ہر رات کسی کی راہ ہے.....“ مگر سلیم نے یہ بات رتنّا سے نہیں کہی۔“

تو بات کیوں نہیں کرتا؟ کسی سے لڑ کے آیا ہے کیا...؟“ رتنّا نے گھبرا کے پوچھا۔“

ہاں میری لڑائی اپنے آپ سے ہوئی ہے۔ سلیم نے یہ بات بھی رتنّا سے نہیں کہی۔ پھر حلق صاف کر کے وہ گہرے پاتال میں سے آہستہ آہستہ کھنے لگا۔

رتنّا، میرے باوا نے تیرے سب رنگ چھین لئے تھے۔ تو سفید ساری کا پلوسر پر“

.....‘ ‘ ڈال کر گاؤں سے چلی گئی تو.....تو

تو کیا ہوا.....؟“رتنّا بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔“

تو میں تیرے پیچھے پیچھے بھاگا.....تو اکیلی تھی نا..... تجھے ملیشمن سے بھوت ڈر لگنا تھا نا؟“

یہ سنتے ہی رتنّا پلو میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی سسکیوں کی آواز سے سلیم کو ایسا لگا جیسے وینکٹی کی ارتھی کا جلوس کھیتوں کے کنارے سے جارہا ہو۔ فضا میں باسی پھولوں اور صندل کی مہک تھی۔ سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی وینکٹی کی لاش کے سینے پر رتنّا کے پھولوں کی بینی، بلدی اور کم کم رکھا تھا۔ مگر ملیشمن نے اس کی سفید ساری پر اپنی ہوس کے دھبے ڈال دیئے تھے۔ آج رتنّا کے چہرے پر کتنے رنگ لگے ہوئے تھے۔ بجاری اکیلی تھی..... خواجہ بی کی طرح، نورا بھابی

.....کی طرح۔ مرغی کے ننھے چوزے کی طرح، جسے چیل جھپٹا مار کے اڑالے جاتی ہے

سلیم نے سراٹھا کر دیکھا۔ رتنّا اپنے آنسو یو نچھ کر دیوار پر کچھ دیکھ رہی تھی۔

تو انتاد بلا کیوں ہو گیا.....؟ کیا بیماری ہے.....؟“

”جیل کا ڈاکٹر بولا کتے میرے کوئی بی کی بیماری ہے۔“

آں.....؟ ٹی بی.....؟ نہیں نہیں۔ رتنا گھبرا گئی۔ ”

‘ ‘ .....میں تیرے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔ تو میرے گھر میں کام کر۔ میں ریڈی سے کہوں گی ”

نکو، ”سلیم گھبرا گیا۔“

ریڈی میرے کو دیکھا تو خوب مارے گا..... میں گاؤں میں اس کی مزدوری

چھوڑ کے ہاں آگیا، رتنا ہنسنے لگی۔

اب ریڈی کسی کو نہیں مارتے ہیں تجھے معلوم ہے وہ منسٹر بن گئے ہیں نا۔ تو نے اخباروں میں ان کے فوٹوئیں ” دیکھے کیا.....؟ وہ جو کام کریں، اخبار میں اس کی خبر چھپتی ہے۔ اب وہ تجھے ماریں گے تو ان کی بدنامی نہیں ہوگی کیا ‘ ‘ ، ؟

رتنما، اب میں جاؤں کیا ؟ ”رتنا کی لمبی چوڑی باتوں کی نظر انداز کر کے سلیم نے اپنا پرانا سوال دہرایا۔ اس کا ” مطلب تھا باسی کھانا ہے تو دو۔

اچھا..... اچھا ٹہر.....“ رتنا خوشی سے کھل اٹھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چیکٹ پلی میں گوبر سے لیپے ” ہوئے چوکے میں سے سانبر اور باسی چاول لانے اٹھی ہو

اؤ..... اندر اؤ۔“..... دوسرے کمرے میں کھڑی رتنا اسے اندر بلا رہی تھی۔ رتنا اب کتنی موٹی ہو گئی ہے۔ اس ” کی چال ڈھال بھی بدل گئی ہے۔

ایک بڑی سی میز پر سیب ، انگور، موز ، چاول، گوشت کا سالن..... جانے کیا کیا رکھا تھا۔ اتنا کھانا..... کیا یہ سب کھانا گھر لے جاؤں؟ اماں بہت خوش ہو جائے گی۔ سیب تو کسی بچے نے ابھی تک نہیں کھائے ہیں۔ اور بکری کا گوشت ! .....جب سری نواس کے منڈن پر وینکٹی کے گھر بکری کے گوشت کی بریانی کی تھی تو

“..... بیٹھ نا..... کھانا کھائے ”

“نکو..... میں کرسی پر نہیں بیٹھتا۔“

“کیوں.....؟ ریڈی سے ڈر رہا ہے تو ؟ میں جو ہوں نا۔ ”

بس پھر کیا تھا۔ دو دن کا بھوکا تھا۔ اچھا ہوا یہاں آ گیا۔ اب ریڈی جوتے مارتا ہے تو مارنے دو۔ سیب تو کھاؤ۔

“تو اس رات کیوں نہیں آیا.....؟ بھوت ہے ایمان ہے تو.....میں ساری رات جاگی۔“

ساری رات“ سلیم نے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ جس سیب کو کھانے کے لئے اس کا جی للچا رہا تھا وہ اس نے ” پلیٹ میں رکھ دیا۔

‘ ‘ ہو.....تو مجھ سے بھی ڈرتا ہے کیا ؟”

“ر تینما... میں تیرے سے نہیں ڈرتا مگر مجھے اس دن اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا۔“

اپنے سے.....؟کیوں.....؟ رتنا اسے دیکھے جارہی تھی۔ ”

سلیم نے نظریں جھکا لیں اور پھر آہستہ سے کہا

تو نے منہ پر اتنے رنگ کیوں لگائے ہیں.....؟”



اس لئے کہ مجھے کوئی نہ پہنچانے میں کون ہوں۔ میں نے تو اپنے بچوں کو بھی بھلا دیا ہے۔ وہ دہلی کے ایک ” اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اسکول کے فارم پر لکھا ہوا ہے کہ ان کے ماں باپ مرچکے ہیں۔ میں اپنے سارے باندھن توڑ چکی ہوں۔ میرا دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ لکڑی کے کچھ پتلی کی ڈوری کھینچو تو وہ ناچنے لگتی ہے۔ چھوڑ دو تو اوندھے منہ گر پڑتی ہے۔

پھر وہ دونوں چپ ہو گئے۔ جیسے کہنے کچھ باقی نہ ہو۔

راملو.....اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ باغ والا کمرہ خالی کر کے اسے دے

”دو۔ آج سے یہ کچن میں اوپر کا کام کرے گا۔

رتنا نے اسے راملو کے حوالے کر دیا۔

اب شامت آگئی۔ ریڈی اسے یہاں دیکھ کر کیا کہے گا۔ اب شامت آگئی۔ جیل بھیج دے تو اچھا ہے۔ آرام سے دن گزرنے لگیں گے۔

رات کو پکانے والے باورچی نے کھانا میز پر لگایا اور چلا گیا۔

جھوٹے برتن اٹھانا۔ کچن صاف کرنا۔ بکھرا ہوا سامان سمیٹنا۔ بے شمار کام تھے۔ وہ جلدی جلدی چھریاں کانٹے دھونے لگا۔

کھانے کے میز کے آس پاس نشے میں چور، دوستوں کے ساتھ بیٹھا ملیشمن ہنس رہا تھا۔

فریج میں سے کچھ نکالنے کے لئے رتنا کچن میں آئی تو پیچھے پیچھے ملیشمن آیا اسے دیکھ کر سلیم کونے میں دبک گیا۔

شریف صاحب آئے ہیں۔ میرا کام کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ بس اب تمہاری مرضی چاہیے.....“ اس نے آہستہ سے ” جھک کر رتنا سے کہا۔

.....شریف کے ساتھ.....؟“ فریج بند کر کے رتنا نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ملیشمن کو دیکھا

نہیں نہیں..... مجھے اس کتے سے نفرت ہے.....“ رتنا کو بہت غصہ

آ رہا تھا۔

تجھے تو ہر مرد سے نفرت ہے..... ملیشمن نے رتنا کی کلائی پکڑ کے ایک تھپڑ

مارا اس کے منہ پر..... دوسرا تھپڑ مارنے والا اس کا ہاتھ اوپر اٹھنے سے پہلے ہی نیچے گر کیونکہ سیب کانٹے والا چاقو اس کے سینے کے آر پار ہو چکا تھا۔ خون کا فوارہ اچھل کے سارے کچن میں پھیل گیا۔

.....سلیم کے منہ پر..... رتنا کی ساری پر

زمین پر گرنے سے پہلے ملیشمن نے اپنے قاتل کو بڑے غور سے دیکھا۔

رتنا! میں جاؤں کیا؟“ چاقو وہیں پھینک کر سلیم نے رتنا سے پوچھا..... مگر وہ تو

اس وقت سچ مچ لکڑی کٹ پتلی بن چکی تھی۔ بے حس و حرکت..... نظریں ایک جگہ ٹھہری

ہوئی.....

.....پھر وہ اپنی قمیص پر سے ٹپکنے والے خون کو نچوڑتا ہوا باہر بھاگا

.....چور.....چور.....پکڑو.....پکڑو

..... مگر وہ بھاگتا رہا ..... بشیر علی نے کہا تھا۔ گاؤں ضرور جانا اپنے پاؤں اپنی دھرتی پر جمائے رکھنا

چیکٹ پلی کے جنگلوں میں جیسے آگ لگی تھی۔ ہر طرف سرخ گل مہر کے پھولوں سے روشنی سی ہو رہی تھی۔ سلیم نے ایک جگہ رک کر زور زور سے سانس لی اپنے گاؤں کے جنگل کی خوشبو اس کی نس نس میں بھر گئی۔ اس جنگل کے ہر.....درخت کی شاخ پکڑ کے وہ جھول چکا تھا

.....دور ہو چما اپنے استہان پر بیٹھی ، آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے گا ..... کہاں جائے گا

سلیم کو گاؤں آتا دیکھ کر بادل بھی خوشی کے مارے بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں .....مرگ لگنے والا ہے..... اب چھینٹے پڑیں گے اس نے جھک کر دیکھا..... ز میں پر گرنے والی یہ بوندیں تھیں یا اس کے آنسو؟

آج کی تازہ خبر .....ایک منسٹر کو دہشت پسندوں نے قتل کر دیا..... اسمبلی میں

اپوزیشن پارٹیوں کا شور و غل۔ چیف منسٹر سے بیان دینے کا مطالبہ۔

جواب دو.....جواب دو..... سلیم کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کے دُور دُور تک پھیل گئی..... ملیشیم کا قتل کیوں ” ہوا.....؟ کوئی ہے؟ اسے ہمارے سامنے

.....حاضر کرو

دُنیا میں لوگ کیا کیا سوال کر رہے ہیں۔ اور ان کے جواب دینے والے کہاں کہاں منہ چھپائے پھر رہے ہیں ! ان سب باتوں سے بے خبر مراد بھائی پوری بندھن کا بوجھ بیل کی بجائے اپنے کاندھے پر رکھے ، چپ چاپ چل رہا تھا۔

سلیم آگے بڑھا۔ اس نے ایک طرف کا جوال اٹھا کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔ مراد نے نظر اٹھا کر سلیم کو دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔ جیسے وہ تو سلیم کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ جیسے اس کے پاس کہنے کے لئے اب کچھ نہ بچا ہو۔

سلیم بھائی..... سلیم بھائی تو آگیا..... کھیتوں میں سے گھانسی چنتی ہوئی نورا بھابی قریب آئی..... اس کے ساتھ ایک چھ سات برس کا بچہ تھا، بالکل ننکا ، پیٹ باہر نکلا ہوا، ناک ٹپکتی..... جوار کی سوکھی روٹی جبار ہا تھا۔

ملیشیم کی اولاد..... سلیم کو اچانک ہنسی آگئی۔ وہی ہنسی جو وینکٹ ریڈی کے بیچ چرا کے اپنے کھیت میں بکھیر تے وقت آئی تھی۔

مراد کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کے پاؤں کھیت کی نرم مٹی میں دھنسے جا رہے

..... تھے۔ جیسے اس کے پاؤں بیچ ہوں۔ زمین میں دبنے کو بے قرار

آس پاس عورتیں مرد اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ بیچ بونے سے پہلے کی تیاری نے سب کو کام میں لگا دیا تھا۔ سلیم کے ساتھ ساتھ بھاگنے والے بادل اب اس کے سر پر جھک آئے تھے..... دور سڑک پر شہر کی بس جا رہی تھی.....سائیکلوں کے پیچھے لکڑی کے گٹھے باندھے لڑکے جنگل کی طرف سے آ رہے تھے..... پھر ایک جیب دھول.....مینسے اُبھری

... ٹھانیں..... ٹھانیں..... گولی سلیم کے سینے کے پار ہوگئی

کیا ہوا..... کیا ہو.....؟ اچانک گاؤں والے چیختے ہوئے بھاگے۔

.....درختوں پر بیٹھے ہوئے کوئے سروں پر چلاتے پھر رہے تھے.....دونگلو

.....دونگلو

اسے دیکھتے ہی ہمیں گولی مارنے کا حکم تھا۔ یہ دہشت پسندوں کے گروہ کا آدمی ہے.....“ ایک انسپکٹر نے گھبرا ” کے کہا۔ کیونکہ اس کے آس پاس کھیتوں پر کام کرنے والے آدمیوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ پولیس کی فائرنگ اچانک ہونے پر وہ سب بہت غصہ میں تھے۔

سلیم.....سلیم بھائی..... نور آ بھابی چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی۔ مگر ایک طرف کا بنڈی کا جواکاندھے پر رکھے مراد اسی طرح کھڑا رہا چپ چاپ، سر جھکائے، جیسے وہ کہیں اور ہو..... یا شاید کہیں بھی نہ ہو۔

مجھے یاں سے نکو اٹھاؤ..... میرا خون میرے کھیت میں بہنے دو۔“ سلیم نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام کے ” کہا۔

.....اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر کسی شدید اذیت سے تڑپ کر اس نے آنکھیں کھولیں

.....بھابی.....“ اس نے ڈوبتی نظروں سے نور آ کی طرف دیکھا”

‘ ‘.....بھابی، اس بچے کو ملیشتم کے ہاں ضرور رہن رکھنا..... یاد..... یاد رکھنا یہ..... بات”

.....بابر کے شور غل سے بے خبر! گھر میں اکیلی بیٹھی، احمد بی چکی گھماتے میں گنگناربی تھی

ہستی مستی کے دانے سرانا گے اماں..... ہر دم اللہ ہو، اللہ ہو

.....آج کھیتوں میں بیچ پڑ رہا ہے

\*\*\*